Scanned by CamScanner

گوپی چند نارنگ

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس
گلی عزیز الدین وکیل۔ ڈاکٹر مرزا احمد علی مارگ، لال کنواں دہلی ۱۱۰۰۰۶

SAFARASHNA
BY
GOPI CHAND NARANG

سال اشاعت — ۱۹۸۲ء

تعداد — ۱۰۰۰

قیمت — ۱۵ روپے

سرورق — خلیق ٹونکی

ناشر — محمد مجتبیٰ خاں
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۱۰۰۰۶
(فون ۵۲ ۶۱ ۶۲)

مطبع — گلوب آفسٹ پریس، دہلی ۱۱۰۰۰۶

اُن احباب کے نام جنھوں نے
ہندوستان اور پاکستان سے
باہر اُردو کی بین الاقوامی بستیاں
بسا رکھی ہیں

فہرست

۱
سیلِ سفر

فرینک فرٹ کیسل مغربی جرمنی

۲
شجرِ سایہ دار

ہیتھرو لندن واشنگٹن نیشنل ٹورنٹو انٹرنیشنل

۳

بہر سو رقصِ بسمل

لندن اُردو کا نیا گہوارہ

۴

منزل منزل عشق و جنون

سکنڈے نیویا اوسلو ناروے

۵

تبسمِ گل فرصتِ بہار

سیلِ سفر

فرینک فرٹ کیسل مغربی جرمنی

ہر چند کہ غالب نے / زہے روانیِ عمرے کہ در سفر گذرد / کہہ کر اُن لمحوں کی روانی کو لائقِ تحسین جانا ہے جو سفر میں بسر ہوں، اور سفر کو حسرت و ارمان کی ایسی کیفیت عطا کی ہے گویا زندگی کے بحرِ ظلمات کا دُرِ نایاب سفر ہی ہو، لیکن ساتھ ہی ایسی شرط بھی لگا دی ہے / اگر بدل نخلد ہر چہ در نظر گذرد / جس کی تکمیل تقاضائے بشریت کے خلاف ہے کیونکہ یہ کیسے ممکن ہے کہ جو مناظر نظر سے گزریں وہ دل میں کھُب نہ جائیں، یا چبھ نہ جائیں، یا جو حوادث و واقعات نور کی لکیر سی کھینچتے ہوئے چھلاوا بن جائیں، وہ دل کے نگار خانے میں اپنا نقش مدھم یا گہرا نہ چھوڑ جائیں۔ حق بات یہ ہے کہ سینہ خواہ داغ داغ ہو، اور پنبہ رکھنے کی بھی حاجت نہ ہو پھر بھی سفر سفر ہے اور تنہائی کے بعد زندگی کے بہترین لمحات اگر کہیں میسّر آتے ہیں تو شاید سفر ہی میں۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو سکتی ہے کہ سفر سے نئے علائق پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن سفر سے سابقہ علائق اور مکانی و زمانی رشتے بیک جنبشِ قدم معدوم بھی ہو جاتے ہیں۔ زماں اور مکاں کی معنویت جیسی سفر سے بدلتی ہے کسی اور طرح ممکن نہیں۔ ہر سفر ایک نئی تنہائی سے شروع ہوتا ہے اور زمان و مکاں کے علائق اور انسانی رشتوں کی بازیافت کے ایک نئے سلسلے کو

جنم دیتا ہے۔ سفر کے تیز رفتار وسیلوں نے فاصلے کچھ اس طرح مٹا کر رکھ دیے ہیں کہ چند ہی لمحوں میں انسان کہاں سے کہاں جا نکلتا ہے۔ ایک دنیا اپنے مانوس مناظر اور بھری پُری یادوں کے ساتھ معدوم ہو جاتی ہے اور دوسری دنیا نئی رنگینیوں اور دلکشیوں کے ساتھ اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ میرے سفرِ مغرب کا پروگرام دو تین برسوں سے بن رہا تھا۔ کئی جگہوں سے تقاضا تھا۔ لیکن کچھ موانع ایسے تھے کہ نکلنا ہی نہ ہوا۔ دس گیارہ برس پہلے جب میں نے وِسکانسن یونی ورسٹی کی پروفیسر شپ کو خیر باد کہا تھا تو یہ ارادہ کر لیا تھا کہ اب آسانی سے باہر نہ نکلوں گا۔ اس دوران پروفیسر بیکر جو وسکانسن میں میرے رفیقِ کار تھے، اور جنھوں نے اردو ہندی صوتیات پر میرے ساتھ مل کر کام کیا تھا، اور اب اشتقاقیات پر کام کر رہے ہیں، دو بار ہندوستان آئے اور مجھ سے وعدہ لے کر گئے کہ اگلی ملاقات وِسکانسن میں ہو گی۔ بعد میں جب ناروے اور لندن کے پروگرام بھی طے ہو گئے تو حامی بھرنی ہی پڑی۔ ارادہ تھا کہ مئی کے اواخر میں نکل جاؤں گا لیکن یارک یونی ورسٹی کے اشتراک سے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں جوانسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونیکیشن قائم کیا جا رہا ہے، اس سلسلے میں جناب انور جمال قدوائی کو کنیڈا کے سفر پر جانا پڑا اور قائم مقام وائس چانسلر کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی تو میرا سفر معرضِ التوا میں پڑ گیا۔ ڈیڑھ ماہ کے تذبذب کے بعد ہنگامی طور پر بالآخر یہ پروگرام طے ہو ہی گیا، اور ۹ر جولائی کو میں نکل کھڑا ہوا۔ پہلی منزل جرمنی تھی، تار تو بھجوا دیا تھا لیکن فون نہ کر سکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صُبح سویرے جب فرینک فرٹ اترا تو نہ ارجن نظر آیا نہ ڈورس نہ پیاری بھتیجی لوئزے۔ یہ تینوں جو ہر سفر میں پھولوں کے گلدستے لیے شیشے کی بالکنی میں مسکراتے ہوئے نظر آتے تھے، آج کہاں تھے؟ دس گیارہ برس بعد فرینک فرٹ کتنا بدل گیا تھا۔ کاؤنٹر، نشستیں، روشنیاں ہر چیز صاف شفاف اور نئی تھی۔ تھوڑی دیر میں میٹنگ پوائنٹ پر پہنچا جہاں بار اور ریستوراں تھا اور گدّے دار کرسیاں رکھی تھیں، یہاں لوگ ملنے والوں کا انتظار کر رہے تھے۔ سوچا کہ پورا نقشہ بدل گیا ہے۔ شاید ملاقات یہاں ہو۔

لیکن جب وہاں بھی کسی کو نہ پایا تو KASSEL فون کیا۔ گھنٹی بجتی رہی، کسی نے نہیں اٹھایا۔ دفتر کا نمبر ملایا تو معلوم ہوا کہ تار ابھی ابھی ملا ہے اور وہ روانہ ہو چکے ہیں کہیں دوپہر کو یہ لوگ پہنچے تو جان میں جان آئی۔ موسم خوشگوار تھا۔ تھوڑی دیر میں ہم سیدھے کاسل کے لیے روانہ ہو گئے۔ دوسری جنگِ عظیم کی ہولناک تباہی کے بعد جرمنوں نے جس طرح اپنے ملک کو بنایا اور سنوارا ہے، دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ شہر خوشنما، سڑکیں کشادہ، کارخانے مصروف اور زمین ہر جگہ کھیتوں، باغوں اور سبزہ زاروں سے ڈھکی ہوئی۔ آسمان صاف تھا، دھوپ کھلی ہوئی، دو گھنٹے کے سفر کے بعد ہم کاسل پہنچ گئے۔ جرمن لوگ صاف ستھرے کشادہ مکانوں میں رہتے ہیں اور نہایت سلیقے سے آرائش زیبائش کرتے ہیں۔ مکانوں کے سامنے چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے سرسبز لان اور طرح طرح کے پھولوں کی بہار۔ کورٹ یارڈ کی طرف پائیں باغ۔ پہلی شام یہیں بسر ہوئی۔ دوسرے دن ہم لوگ صبح سویرے ہائیڈل برگ کے لیے نکل گئے۔ گھنے جنگلوں اور خوشنما وادیوں سے گزرتے ہوئے جب دو پہاڑیوں کے بیچ بہنے والے دریائے نیکر کے کنارے پہنچے تو ہائیڈل برگ کی برجیوں نے دور سے خوش آمدید کہا۔ ہائیڈل برگ بنیادی طور پر یونی ورسٹی قصبہ ہے۔ یہی وہ مشہور دانشگاہ ہے جہاں سے علامہ اقبال نے پی ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی تھی۔ "دریائے نیکر کے کنارے ایک شام" اور کئی دوسرے اشعار میں ہائیڈل برگ کے مناظر سموئے ہوئے ہیں۔ یہی وہ فضائیں تھیں جہاں اقبال کی دعوت پر عطیہ فیضی مع اپنے لاؤلشکر کے ۲۰ر اگست ۱۹۰۷ء کو تشریف لائی تھیں اور ۴ر ستمبر ۱۹۰۷ء کو واپس لوٹی تھیں۔ علامہ اور ان کے ساتھیوں کے یہ پندرہ سولہ دن خواب کی سی کیفیت میں بسر ہوئے تھے۔ دریا کے کنارے یونی ورسٹی قہوہ خانے میں سب اکٹھے ہوتے، فلسفے پر بحثیں ہوتیں، کافی پی جاتی اور رات گئے تک ہنسی مذاق ہوتا۔ اقبال نے عطیہ فیضی کو انھیں فضاؤں میں یونانی مجسمے: آبشار، تالاب، انواع و اقسام کے پھل دار درخت اور طرح طرح کے پرندے

بھی دکھائے اور کلیسا، باغات، آرٹ گیلریوں اور کتب خانوں کی سیر بھی کرائی۔ عطیہ فیضی سے روایت ہے کہ آئر باخ کی پہاڑیوں میں سب مل کر سیر کرتے، پیڑوں سے سیب توڑتے، پھول اکٹھے کرتے، لوک ناچ میں حصہ لیتے اور اوپن ریستورانوں میں کھانا کھاتے۔ جب عطیہ فیضی کے رخصت ہونے کا وقت آیا تو سب لوگ دائرے میں کھڑے ہوگئے، عطیہ سامنے تھیں اور بینڈ کے ساتھ اقبال کی رہنمائی میں جرمن زبان میں تحریر کردہ الوداعی نظم کورس میں گائی گئی:

آخر کار ہندوستان کے نہایت درخشاں ہیرے کو
خدا حافظ کہنے کا وقت آ ہی گیا
وہ تارا جو یہاں چمکتا تھا اور رقصاں رہتا تھا
اور دور نزدیک سب کو روشن رکھتا تھا ...
ہماری بہترین دعائیں اور برکتیں اپنے ساتھ لیتی جاؤ
دریاؤں، جھیلوں اور سمندروں کو عبور کرتے وقت
ہماری بہترین خواہشات اپنے ساتھ لیتی جاؤ
الوداع، الوداع

یوں تو جرمنی میں ہمبرگ یونی ورسٹی اور ہیڈ گاڈز برگ کے اداروں میں بھی اردو پڑھائی جاتی ہے لیکن ہائیڈل برگ یونی ورسٹی کو اس لحاظ سے اہمیت حاصل ہے کہ یہاں دوسری جگہوں کے مقابلے میں اُردو درس و تدریس اور تحقیقات کا کام خصوصیت کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اردو کا چار سالہ نصاب یہاں جنوب ایشیائی مرکز میں پڑھایا جاتا ہے۔ ہندی کی تعلیم ڈاکٹر لوتھر لوتزے کے ذمے ہے جنھوں نے پریم چند پر خاصا کام کیا ہے اور ہندی کی جدید کہانیوں اور نظموں کے تراجم بھی کیے ہیں۔ اردو کی خدمت ڈاکٹر سید مجاہد حسین زیدی کے سُپرد ہے جنھوں نے ابھی چند برس پہلے جرمنی کے کُتب خانوں میں محفوظ اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست شائع کی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے سوانح نگاری اور لفظی تشکیلات کے موضوعات پر بھی کام کیا ہے۔

ہائیڈل برگ یونی ورسٹی میں اقبال کی یادگار کے طور پر حکومتِ پاکستان نے اقبال چیر قائم کی تھی اور اس سلسلے میں چند برس تک ڈاکٹر محمد اجمل وہاں اقبال پروفیسر کی حیثیت سے اقبالیات کی تعلیم بھی دیتے رہے تھے۔ لیکن اب یہ منصوبہ غالباً معطل ہو گیا ہے۔ جرمنی سے "تاریخِ ادبیاتِ ہندوستان" کے نام سے ایک ضخیم اور مبسوط تاریخ شائع ہو رہی ہے جسے پروفیسر جان ہونڈا مرتب کر رہے ہیں۔ اس تاریخ کو اس عہد کا کارنامہ کہنا چاہیے کیونکہ یہ ہندوستان کی تمام اہم زبانوں کے ادب کے تحقیقی مطالعے پر مشتمل ہے۔ اسے تین ممتاز مستشرقین نے تصنیف کیا ہے، اور یہ دائرہ زبادن سے پندرہ جلدوں میں شائع ہو رہی۔ اب تک نو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں ساتویں اور آٹھویں جلد ہند ایرانی زبانوں کے ادب کے لیے مخصوص ہے۔ جدید اردو ادب کی تاریخ راقم الحروف نے لکھی ہے۔ اسلامی ادبیات کا تحقیقی جائزہ انماریہ شمل نے لکھا ہے۔ انھیں نے کلاسیکی اردو ادب اور سندھی ادب کی تاریخ بھی لکھی ہے۔ یہاں کئی پرانے احباب سے ملاقات ہوئی۔ لائبریری سے ایک مثنوی کی مائکروفلم حاصل کرنا تھی جس کے لیے پہلے سے لکھ دیا تھا۔ کچھ وقت اس میں صرف ہوا کیونکہ اگلے دن صبح فرینک فرٹ سے واشنگٹن کے لیے روانگی تھی اور فاصلہ خاصا تھا، اس لیے شام کی چائے کے بعد ہم ہائیڈل برگ کی پہاڑیوں اور قدیم و جدید عمارتوں کو بادلوں کی دھند میں پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

جرمنی کا دارالخلافہ اگرچہ بون ہے لیکن قلب فرینک فرٹ ہے۔ قیصر اسٹریٹ جو یہاں کی مرکزی شاہراہ ہے، اس کے دونوں طرف دور تک فلک بوس عمارتوں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ نیچے بازار ہے۔ آراستہ پیراستہ دکانیں، چہروں سے دمکتے ہوئے کیفے اور ریستوراں اور بیچ بیچ میں سبزہ زار ہیں۔ پیدل چلنے کے راستوں کو چھوٹے چھوٹے پتھروں سے پختہ کیا گیا ہے۔ ہر کونے پر ٹیلیفون کے بوتھ ہیں۔ اور بینچ اور کرسیاں رکھی ہوئی ہیں۔ موسم چونکہ اچھا تھا، اس لیے جگہ جگہ ریستورانوں کے سامنے رنگ برنگی کرسیاں میزیں سجائے چھتریاں لگائے لوگ بیٹھے چائے کافی،

بیئر پی رہے تھے، اور نظارہ کر رہے تھے۔ پھلوں اور پھولوں کی دکانوں کی فرینک فرٹ میں بڑی افراط ہے۔ خاص طور سے آڑو، آلو بخارے اور شفتالو خوب خریدے جارہے تھے۔ ریڑھی والے ہمارے یہاں کی طرح زور زور سے آوازیں لگاتے اور رنگین کاغذوں میں مال لپیٹ لپیٹ کر دیتے جاتے تھے۔ میں تھوڑی دیر کے لیے سامنے کے سبزہ زار میں گوئٹے کے مجسمہ کے قریب بینچ پر بیٹھ گیا۔ مال کے بیچوں بیچ ٹرام زناٹے سے چل رہی تھی۔ بازار چونکہ کشادہ ہیں اس لیے گاڑیوں کے راستے وسط میں بنے ہوتے ہیں۔ نئی وضع کی نہایت خوبصورت تیز رفتار لمبی لمبی برقی گاڑیاں زن سے آتیں، پل دو پل کو رکتیں اور سواریاں لے کر یہ جا وہ جا۔ دس پندرہ برس میں فرینک فرٹ کتنا بدل گیا تھا۔ ریل کے زمین دوز اسٹیشنوں میں بھی ایک دنیا آباد نظر آئی۔ نیویارک کے بدنامِ زمانہ انڈر گراؤنڈ اسٹیشنوں سے یہاں کی فضا کتنی مختلف تھی۔ دکانیں آئینہ خانہ معلوم ہوتی تھیں۔ کارونیشن کے قریب پھولوں کی دکانوں کو میں دیکھتا ہی رہا۔ صبح کے سات بجے تھے، فرش ڈھل رہا تھا۔ نیچے اترتے ہوئے بجلی سے چلنے والے زینے ساکت اور دم بخود دکھائی دیے۔ اِکا دُکا کوئی دور سے آتا ہوا دکھائی دے جاتا تھا۔ ٹکٹ کی کھڑکی بند تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا میرے پاس سکے نہیں تھے مارک تھے۔ الجھن ہونے لگی کہ کہیں کھڑا ہی نہ رہ جاؤں۔ اتنے میں میں نے مشین میں نوٹ ڈالا اور منزل کی نشان دہی کرنے والے بورڈ پر سوئچ دبایا تو کھٹ سے ایک طرف ٹکٹ اور دوسری طرف سکے اچھل پڑے۔ کمپیوٹر کے بڑھتے ہوئے استعمال نے کیا کیا سہولتیں پیدا کردی ہیں۔ آگے جانے کا راستہ بند تھا۔ گیٹ کے کنارے ایک جھری دکھائی دی۔ جوں ہی اس میں ٹکٹ سرکایا، معاً راستہ کھل گیا اور مہر شدہ ٹکٹ دوسری طرف اچھل کر نکل آیا۔ ساکت سیڑھی پر جیسے ہی پیر رکھا سبز بتی جلی اور زینہ خود بخود حرکت کرنے لگا۔ سامنے اسٹیشن تھا۔ گاڑیاں آجارہی تھیں۔ پلیٹ فارم پر پوری ہدایات اور نشانات روشنی میں نہائے ہوئے تھے۔ ڈبے انتہائی شفاف اور آرام دہ۔ خود کھلتے اور بند

ہوتے ہوئے دروازوں نے ہر طرح کے شور کو باہر چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں ایر پورٹ کے عین نیچے کے اسٹیشن پر اترا۔ یہاں سے برقی زینوں کے ذریعے جب دوسری منزل پر آیا تو پورا ایر پورٹ زندگی سے تھرتھراتا اور آوازوں سے گونجتا ہوا نظر آیا۔ یہاں سے لندن پہنچنا تھا اور پھر وہاں سے واشنگٹن کا لمبا سفر بھی آج ہی کرنا تھا۔ کتنا لمبا دن ہوگا۔ فرینک فرٹ اور لندن کے وقت میں ایک گھنٹے کا فرق ہے اور لندن سے واشنگٹن چھ گھنٹے پیچھے ۔ گویا آج سورج سات گھنٹے دیر سے ڈھلے گا۔

شجر سایہ دار

ہیتھرو لندن واشنگٹن نیشنل ٹورنٹو انٹرنیشنل

تقریباً ایک گھنٹے کی پرواز کے بعد جہاز ہیتھرو اترا - ہوا میں کچھ نمی تھی لیکن موسم خوشگوار تھا - یہاں ڈھائی گھنٹے لاؤنج میں گزارنے تھے - اتوار کا دن تھا - مجھے یقین تھا کہ ساقی فاروقی یا عبد اللہ حسین میں سے کسی نہ کسی سے فون پر ضرور بات ہوجائے گی - مسافروں کا اتنا ہجوم تھا کہ خدا کی پناہ - تقریباً آدھے گھنٹے تک ناکے پر رکنا پڑا - بے حد کوفت ہوئی - صفیں بندھ رہی تھیں - دوبارہ چیکنگ کی وجہ سمجھ میں نہ آئی - شاید دوہرے حفاظتی انتظامات کی وجہ سے ضروری تھا - کاؤنٹر پر جاکر دوبارہ سیٹ الاٹ کرائی - لاؤنج میں لوگوں کے پرے کے پرے جمے ہوتے تھے - سامنے ریستوراں تھا - دوسری طرف بار - لوگ بیر پینے میں مصروف تھے - میں نے ایک سینڈوچ اور کافی کی پیالی لی اور کچھ رقم برٹش پونڈ میں تبدیل کرائی - ریستوراں میں پیالیاں اٹھانے، چائے بنانے اور کیش رجسٹر چلانے والے لڑکے لڑکیاں سب ہندوستانی پاکستانی تھے - دس برس میں ٹیلیفون کا نظام بھی کچھ کچھ بدل گیا تھا - لندن میں طریقہ ہے کہ پہلے نمبر گھماتیے، پھر پپ پپ کی آواز آتی ہے تب سکہ ڈالنا پڑتا ہے - اتوار کا دن تھا ساقی فاروقی اپنے جانوروں کے ساتھ محوِ گفتگو تھے، نمبر گھماتے ہی مل گئے - دل خوش ہوا - کہنے لگے میں نے سوچا تم اوپر ہی اوپر نکل گئے اور خبر بھی نہ کی - بہت دیر بات ہوتی رہی - ان کی آسٹرین رفیقۂ حیات گنڈی سے بھی بات ہوئی - میں نے

پروگرام کی توثیق کردی کہ واشنگٹن، وِس کانسن اور ٹورینٹو سے نمٹنے کے بعد ۱۱/ اگست کو لندن پہنچوں گا اور ۲۶/ اگست تک ان کے لیے پریشانی کا باعث بنوں گا۔ ساقی اور گُنڈی نے فرمائش کی کہ ممکن ہو تو ایک دن کے لیے رک جاؤں لیکن یہ بر بنائے محبت تھا۔ انھیں بھی معلوم تھا کہ پرواز کے قوانین کی رو سے یہ ممکن نہیں تھا۔ عبداللہ حسین کے یہاں بار بار گھنٹی بجتی رہی۔ کوئی اٹھانے والا نہیں تھا۔ بہرحال ساقی سے بات کرکے یک گونہ اطمینان ہوا۔ خاصا چلنے کے بعد ڈھائی بجے تک میں اس کانکورس میں پہنچ گیا جہاں سے واشنگٹن کے لیے جہاز لینا تھا۔ جمبو میں تو کئی بار بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن یہ جہاز اس کا ذرا چھوٹا نمونہ تھا۔ چاروں انجن اور آگے کا حصہ ویسا ہی، لیکن پیچھے کی طرف نشستیں بہت کم تھیں۔ یہ ممکن تھا کہ میں لندن سے سیدھا نیویارک جاتا اور وہاں سے فلائٹ بدل کے واشنگٹن روانہ ہوتا، لیکن نیویارک سے مجھے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ چنانچہ جب براہ راست واشنگٹن کی فلائٹ صاف ستھری اور مزے کی نظر آئی تو اپنے فیصلے پر مسرت ہوئی۔ دس گیارہ برس میں فضائی سفر کے طور طریقوں میں بھی کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور آگئی تھی۔ پہلے ٹرانس اتلانتک سفر تیر کی طرح ہوتا تھا اور اس میں آٹھ سے نو گھنٹے لگتے تھے۔ اب معلوم ہوا کہ پرواز آئرلینڈ سے ہوتی ہوئی قطب شمالی سے نکلتی ہوتی کینیڈا کی فضا سے گزرے گی اور پھر مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ پرواز کرتی ہوئی واشنگٹن پہنچے گی۔ چنانچہ اتلانتک کے اوپر کا سفر چار گھنٹے سے زیادہ کا نہیں تھا۔ جہاں جہاں مطلع صاف تھا کینیڈا، نیویارک، مین ہیٹن کے مناظر بہت بلندی سے دھندلے دھندلے نظر آئے اور شام ساڑھے پانچ بجے تک ہم ڈلس پہنچ گئے۔ برادر محترم جگدیش چندر صاحب، بھابی صاحبہ، ڈاکٹر انل، سنیل، دونوں بیٹیاں انیتا، کامنی اور اُن کے شوہر ڈاکٹر کیلاش، ڈاکٹر سدھیر سب موجود تھے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کے اندر اندر ہم سلور سپرنگ میری لینڈ پہنچ گئے۔ صاف ستھرا تین منزلہ کشادہ اور آرام دہ مکان تمام ضروریات زندگی سے آراستہ نظر آیا۔ رات میں بھائی صاحب کے دوست

احباب، دور نزدیک کے عزیز و اقارب، اور ملنے ملانے والے آ گئے، اور یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ وقت چونکہ زیادہ نہیں تھا اس لیے واشنگٹن کا قیام میں نے عمداً نجی رکھا تھا۔ دو دن کے بعد ۱۵ر جولائی کو ٹورینٹو پہنچنے کا پروگرام تھا۔ اندرون ملک اور کینیڈا کے جہاز واشنگٹن نیشنل سے نکلتے ہیں۔ عمداً میری لینڈ سے واشنگٹن نیشنل تک کا سفر ہم نے سب وے سے کیا۔ واشنگٹن میں سب وے چند ہی برس پہلے شروع ہوئی ہے۔ سفید رنگ کی انتہائی تیز رفتار پتلی لمبی گاڑیاں گہرے چاکلیٹ اور ہلکے سرخ رنگ کے فرش دیکھ کر فرانس کی یاد تازہ ہوگئی۔ اسٹیشنوں کے نام کا اعلان برابر ہوتا رہا، حتیٰ کہ ہم واشنگٹن نیشنل کے ساتھ ساتھ چلتے رہے اور ہمارے سامنے جہاز مخالف سمت میں پرواز کرتے ہوئے نظر آنے لگے۔ یہ منظر بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا کہ شہر کے بیچوں بیچ رن وے سے ایک کے بعد ایک پرواز کرتے ہوئے جہاز پیٹومک کے سینے کو ترچھا کاٹتے ہوئے جیفرسن میموریل اور واشنگٹن مانومینٹ کے پہلو سے نکلتے ہوئے اوپر کو اٹھتے اور دریا سے پرے کی دُھند میں تحلیل ہو جاتے۔ ڈی سی نو میں تینوں انجن پیچھے کی طرف ہوتے ہیں یہ تیر کی طرح نکلتا ہے اور آگے کی سیٹوں میں معمولی سا ارتعاش تک محسوس نہیں ہوتا۔ دو گھنٹے کا سفر پلک جھپکتے میں نکل گیا۔ ٹورینٹو انٹرنیشنل پر اُترنے کے بعد بہت دیر تک ایک بند گلی سے گزرنا پڑا جس کے دونوں طرف کامن ویلتھ ملکوں کے مناظر بنے ہوئے تھے۔ ان میں تاج محل کا پیکر بار بار استعمال کیا گیا تھا۔ امیگریشن سے نکل کر باہر آیا تو سامنے بیٹا ارون منتظر تھا۔ چند ہی برسوں میں وہ کیسا کشیدہ قامت اور وجیہہ و شکیل نکل آیا تھا۔ تین سال پہلے گرما کی تعطیلات میں وہ ہندوستان آیا تھا اور ادھر وہ اپنی تازہ تصویریں بھی بھیجتا رہا تھا، لیکن لمبی ترشی ہوئی موچھوں سے چہرہ بدلا ہوا نظر آیا۔ بچے اس عمر میں کس تیزی سے بڑھتے ہیں۔ وہ آتے ہی لپٹ گیا اور کچھ دیر کے لیے میں بھول گیا کہ کہاں ہوں۔ ٹورینٹو میں پانچ دن رہنے کا پروگرام تھا۔ ارون یہاں میڈیکل کالج میں زیرِ تعلیم ہے اور گرمیوں میں اسکاربرو کے گورنمنٹ ہسپتال

کے ایمرجنسی سیکشن میں کام کررہا تھا۔ اگرچہ ایک دن یارک یونی ورسٹی اور ایک دن ٹورینٹو یونی ورسٹی کے لیے محفوظ تھا لیکن کینیڈا کے دورے کی حیثیت یکسر نجی تھی اور میں نے کسی کو اطلاع نہیں کی تھی تاکہ ان پانچ دنوں میں زیادہ سے زیادہ وقت اردن کے ساتھ گزار سکوں۔ ٹورینٹو میں اگرچہ واشنگٹن والی بات نہیں لیکن شہر کے مرکزی حصے اور خاص خاص عمارتوں کو میں نے نہایت خوبصورت پایا۔ سٹی سنٹر مجھے اس لحاظ سے پسند آیا کہ شہر سے الگ تھلگ ایک پُرفضا مقام پر اونچی سی ایک خاموش عمارت تھی۔ چاروں طرف خوش وضع لان اور فوّارے اور بیچوں بیچ حوض تھا جس میں بطخیں تیر رہی تھیں اور کنارے پر بینڈ شام کی دھن بجا رہا تھا۔ مرد عورتیں بینچوں پر بیٹھے سُستا رہے تھے اور بچے جھینٹے اڑاتے پھرتے تھے۔ بجلی پانی اور دوسری شہری ضروریات کے دفاتر یہیں تھے اور سب سے بڑے ہال ریڈنگ روم اور لائبریری کے لیے وقف تھے۔ گہرے بینگنی رنگ کے قالین اور صاف ستھری الماریوں میں قرینے سے رکھی ہوئی کتابیں تاحدِ نظر پھیلی ہوئی تھیں۔ فراغت د کتابے و گوشۂ چمنے کی کیفیت تھی۔ عجیب طمانیت اور آسودگی کا احساس ہوا۔ ہر آئیل کے قریب کچھ نہ کچھ لوگ پڑھنے لکھنے میں مصروف نظر آتے۔ خدا توفیق دے تو انسان ساری زندگی ایسی جگہ پر گزار دے۔ اس سے کچھ فاصلے پر چھت دار بازار تھا۔ یوں تو اب جگہ جگہ چھتے ہوئے بازاروں کا رواج ہو گیا ہے جنھیں یہاں شاپنگ مال کہتے ہیں۔ شیشے کی چھت، بارش اور برف سے محفوظ، دن کی روشنی چھن چھن کر آتی ہوئی اور رات میں تاروں اور روشنیوں کا جال بچھا ہوا۔ ایٹین پلازا میں ایک خاص طرح کی خوش وضعی نظر آتی جو آنکھوں کو بھلی لگی۔ ٹورینٹو یونی ورسٹی شہر کے بیچوں بیچ ہے۔ عمارتیں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ وسط میں ایک چوڑی سڑک، پھولوں کو آغوش میں لیے تھی۔ یہاں کتابوں کی ایک بہت بڑی دکان دیکھی اس کئی منزلہ عمارت میں بلا مبالغہ لاکھوں کتابیں ہوں گی۔ کئی ملکوں اور کئی زبانوں کی کتابیں۔ یارک یونی ورسٹی شہر سے باہر ہے۔ اس کا اپنا کردار ہے یعنی لبرل آرٹ

اور سوشل سائنسز کی تعلیم کے لیے یہ دانش گاہ پورے کینیڈا میں مشہور ہے۔ نہایت خوبصورت کیمپس، ترشے ہوئے لان، خوشنما عمارتیں، کھلی سڑکیں۔ اس یونی ورسٹی کے اشتراک سے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونیکیشن قائم کرنے کی تجویز ہے۔ پروفیسر بیوریج جن کا شمار جامعہ ملیہ اسلامیہ کے دوستوں میں کرنا چاہیے، یہیں شعبۂ فلم میں پڑھاتے ہیں۔ پروفیسر فاکس شعبۂ فلم کے صدر ہیں۔ ارون کی سپورٹس کار میں جس کے ہڈ پر عقاب کے پر پھیلے ہوئے تھے جوں ہی ہم صدر دروازے کے قریب پہنچے شیشے کے کمرے میں بیٹھی ہوئی خاتون نے ہمارا استقبال کیا۔ کار کے شیشے پر چپکانے کے لیے اجازت نامہ دیا اور یونی ورسٹی کا نقشہ دیتے ہوئے بتایا کہ بائیں طرف سے سوشل سائنسز عمارت میں داخل ہوکر گیارھویں منزل پر پریذیڈینٹ میکڈانلڈ یعنی یارک یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کا دفتر ہے جن سے لنچ پر میری ملاقات طے تھی۔ پروفیسر میکڈانلڈ معاشیات کے پروفیسر ہیں۔ وہ اور ان کے احباب بہت دیر تک جامعہ کے بارے میں گفت گو کرتے رہے۔ انھوں نے بتایا کہ یارک یونی ورسٹی نے بعض افریقی ممالک کے علمی پروجیکٹ میں بھی اشتراک کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ یہاں کے پروفیسروں میں ہندوستان سے بالعموم دلچسپی پائی جاتی ہے۔ میکڈانلڈ مشکل سے چالیس برس کے ہوں گے۔ معلوم ہوا کہ سات برس سے وہ یونی ورسٹی کے صدر ہیں اور ان کی نظامت میں یونی ورسٹی نے بڑی ترقی کی ہے۔ ان کے دفتر میں چاروں طرف شیشے کی کشادہ کھڑکیوں سے کیمپس کا پورا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ انھوں نے خاص خاص شعبوں اور عمارتوں کی نشان دہی کی۔ تقریباً چار بجے تک ہم یونی ورسٹی ہی میں رہے۔ کچھ وقت لائبریری میں گزرا۔ اور کچھ طلبا کے مرکز میں جہاں چھوٹی سی مال تھی جس میں طلبا کے ضروری سامان کی تمام دکانیں تھیں۔ کیفے کے شیشوں سے باہر چنار کے لمبے لمبے پیڑوں کے نیچے چھوٹے چھوٹے حوضوں کے کنارے سفید بینچ رکھے ہوئے تھے۔ یہاں طلبا کے جھرمٹ میں ایک پیڑ کے نیچے ارون اور میں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔

آخری دن نیاگرا کے سفر کے لیے مخصوص تھا۔ اولڈز میں ہائی فائی کا سب انتظام موجود تھا۔ بیگم اختر، مہدی حسن، غلام علی خاں، جگجیت سنگھ، ولایت علی خاں، روی شنکر۔ اس سفر میں سب ہی سے ملاقات ہوگئی۔ اردن کو یوں بھی موسیقی اور شاعری سے نسبت ہے اور اس نے میری پسند کا بھی خیال رکھا۔ نیاگرا کی فضا میں ہتھیلیوں پر پانی برستا ہوا محسوس ہوا۔ آبشاروں کے اوپر دور دور تک پانی کی چھوٹی چھوٹی بوندیں گر رہی تھیں۔ موسم میں عجیب سرشاری اور لطافت تھی۔ اٹلی، شام، روم، چین، جاپان، سوئیڈن، ناروے، ہانگ کانگ ہر چہرے کا اپنا منظر تھا۔ بدن کے چمن دیکھتے معلوم ہوتے تھے۔ کون سا ملک تھا جس کے باشندے چہروں اور رنگوں کی اس ریل پیل میں نظر نہ آئے ہوں، طرح طرح کے نقش، طرح طرح کی رنگتیں اور طرح طرح کی بولیاں۔ یہاں میں پہلے بھی دو بار آچکا تھا لیکن اردن کے ساتھ نیاگرا آنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ یا شاید موسم کا اثر تھا۔ ایسا ہجوم اور ایسی رونق میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی گویا فضا سے رنگ و نور کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ یوں تو قدرت کا سینہ ہر جگہ کھلا ہے اور حسن کہاں نہیں لیکن قدرت نے میلوں تک بہتی ہوئی پانی کی چاندی سی چادر سے یہاں جو لطف پیدا کیا ہے وہ عجائباتِ روزگار میں سے ہے۔ سفید جھاگ کے پہاڑ اٹھاتا ہوا پانی جب قریب آتا ہے تو پگھلا ہوا زمرّد بن جاتا ہے پھر نہایت تیزی سے بہتا ہوا یہ زمرّد دل کی شکل میں کٹی ہوئی قاش سے ہزاروں فٹ نیچے گرتا ہے اور دھند کے بادل اڑاتا ہوا دوسری طرف کو بہتا ہوا چلا جاتا ہے سامنے کی طرف بھی آبشاروں کا منظر ہے لیکن اس میں وہ شکوہ اور جمال نہیں جو اِدھر کے منظر میں ہے۔ ریلنگ کا سہارا لے کر لمحہ بھر کے لیے رکیے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ گہرا نیلا سبز پانی اپنی جگہ ٹھہر گیا ہے، اور ہم ہیں کہ اس کی روانی کے ساتھ پیچھے کی طرف اور پیچھے کی طرف بہے چلے جاتے ہیں۔ اس سحر آگیں کیفیت میں زمین پیروں کے تلے سے نکلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

ٹورینٹو کا قیام اگرچہ نجی تھا لیکن ہوتے ہوتے احباب کو معلوم ہو ہی گیا۔ مالک رام صاحب کی بیٹی ارونا اور ان کا بڑا بیٹا سلمان ٹورینٹو ہی میں ہیں۔ میں ان کے یہاں ملنے گیا تو کیلاش دگل کے ذریعے حفظ الکبیر قریشی، کرنل انور احمد، اور دیگر احباب کو بھی اطلاع ہوگئی اور شدہ شدہ یہ خبر سب میں پھیل گئی۔ نیز شکایت پیدا ہوگئی کہ اطلاع کیوں نہیں کی۔ احباب کے اصرار کے سامنے میری یوں بھی نہیں چلتی۔ لیکن کرتا بھی کیا، وسکانسن یونی ورسٹی کا پروگرام پہلے سے طے تھا اور اگلے دن شکاگو سے ہوتے ہوتے میڈیسن پہنچنا تھا۔ احباب کے تقاضوں سے نمٹنے کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ وسکانسن کے بعد ٹورینٹو دوبارہ آؤں اور لندن کو واپسی یہیں سے ہو، لیکن یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ ایک ہفتہ واشنگٹن بھی رکنا تھا۔ بہرحال آنے جانے کا ٹکٹ فراہم ہوگیا اور طے پایا کہ میں ۴ر اگست کو لوٹ آؤں اور چار پانچ دن یہاں رکوں۔ انجمن اُردو کنیڈا کے روح و رواں محمد حفظ الکبیر قریشی صدر بیدار بخت اور سکریٹری انور احمد کی فرمائش پر طے پایا کہ لیکچر یونی ورسٹی آف ٹورینٹو میں ہوگا اور اس کا ابھی سے اعلان کردیا جائے گا۔

میڈیسن دیارِ دلبراں

اب تک کے سفر میں میں کسی ناسٹلجیائی کیفیت کا شکار نہیں ہوا تھا علمی اور نجی سفر کے دائرے بھی الگ الگ تھے لیکن جیسے ہی مڈویسٹ کی فضا میں داخل ہوا ایک عجیب احساس نے مجھے آلیا۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں میں نے جوانی کے پانچ برس صرف کیے تھے، اُردو کی تعلیم و تدریس کے لیے مقدور بھر سعی کی تھی، اور دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا تھا۔ شکاگو اوہیر پر اترتے ہی پرواز بدلنے کے لیے جیسے ہی میں شیشے اور فولاد کے لمبے برآمدوں سے گزرا تو بے ساختہ وہ دن یاد آگئے جب اٹھارہ برس پہلے میں اپنے بچوں کو لینے کے لیے ایک اجنبی کی حیثیت سے یہاں آیا تھا۔ پھر ایک دن انھیں روشنیوں کے نیچے ہم آلِ احمد سرور

اور بیگم سرور کو لینے اور چھوڑنے آتے تھے اور جانے کن کن کو ؟ کیسے کیسے رشتے اور کیسی کیسی یادیں تھیں - شکاگو اور میڈیسن کا چند گھنٹوں کا سفر، روز کا آنا جانا - کبھی چودھری محمد نعیم کا ہمیں بلانا، کبھی ان کا ہمارے یہاں آنا، ہندوستانی پاکستانی دوست احباب کی ریل پیل، صبح و شام کی نشستیں، محفلیں، مشاعرے، لیکچر، سیمینار سب مناظر آنکھوں میں گھوم گئے - اُردو کے رشتے کہاں تک ہیں اور کہاں نہیں، کہاں زبان کی حد ختم ہوتی ہے اور جان کی شروع ہوتی ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا - یا کوئی سطح ایسی بھی ہے جہاں جسم، جان، روح، ایمان سب تحلیل ہوجاتے ہیں اور محض عین باقی رہتا ہے - کیا میرے لیے اُردو ایسا ہی عین رہا ہے - شام کا وقت تھا سورج اتر رہا تھا - زندگی کا سُورج بھی توڈھلان پر آگیا تھا - محنت اور لگن کا بدل آخر کیا ہے؟ چند سکوں کے لیے تو میں نے یہ سب کچھ نہیں جھیلا تھا - کیا کھویا کیا پایا تھا - کیا یہ سب گھاٹے کا سودا تھا - کس لیے ؟ کتنی بار یہاں کی پر آسائش زندگی میں پروفیسر شپ کی پیشکش کی گئی لیکن میں نے معذرت کرلی - کیسا کیسا جوکھم مول لیا، کیوں ؟ کیا ایسا عنیبت پرستی کی وجہ سے تھا یا تصوریت کا کوئی فریب تھا - شاید ہاں، لیکن اس کا جواب اتنا آسان نہیں تھا - عقل کی ترازو میں سب باتیں کہاں تولی جاتی ہیں - عشق کی تقویم میں ماہ و سال کے علاوہ اور زمانے بھی ہیں - جو بھی کیا ٹھیک کیا - جیسے بھی گزری خوب گزری کیونکہ سود و زیاں کا وسواس نہیں کیا اور زبان و جاں کا رشتہ ملحوظ رہا - کیسی کیسی ملامتوں کے درمیان بسر کی لیکن ہمت نہیں ہاری - دہلی کے ان کرم فرماؤں کی بھی یاد آئی جنھیں خدا نے سب کچھ دیا ہے لیکن وہ اپنی صلاحیتوں کو حسد اور رقابت کی راہ میں فیاضی سے لٹاتے رہتے ہیں، جو بڑی بڑی انسان دوست تحریکوں سے وابستہ ہیں، لیکن جنھیں سازشیں بونے اور نفرتیں کاٹنے میں کمال حاصل ہے کیونکہ ذہنی کشادگی اور انسانیت سے ان کی صاحب سلامت بھی نہیں - اللہ ان پر رحم کرے اور انھیں جہنم کی آگ سے محفوظ رکھے کیونکہ ان بیچاروں کو نہیں معلوم کہ "عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا"

اس راہ میں تو پتہ پانی ہو جاتا ہے۔ اُردو میرے لیے دیوانگی کا سودا کب نہیں تھی:

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں (آزردہ)

وحشتِ دل منزل منزل صحرا صحرا لیے پھرتی ہے۔ اوس کی بوندیں چند لمحوں کے لیے پتّیوں کے دامن پر لرزتی ہیں پھر وہی آفتابِ عالم تاب اور اُس کی وجود سوز تمازت! پرواز نواحِ جاں میں پہنچ چکی تھی۔ میڈیسن جھیلوں کے کنارے چھوٹا سا یونی ورسٹی شہر ہے۔ کسی زمانے میں میڈیسن ایرپورٹ پر چھوٹے چھوٹے پنکھوں والے جہاز اُترا کرتے تھے۔ دنیا کتنی بدل چکی تھی۔ جیٹ چکّر کاٹتا ہوا اتر رہا تھا۔ بڑی جھیل مینڈوٹا کے کنارے بیکم پہاڑی پر یونی ورسٹی کا صدر دفتر درختوں کے جُھنڈ میں گھرا نظر آرہا تھا۔ جھیل کے نیلے پانی کے کنارے کنارے اسٹیٹ اسٹریٹ چلتی ہوئی کیپٹل اسکوائر کے چاروں طرف گھوم گئی تھی۔ وہی گنبد، وہی بازار کی چوپڑ، وہی مینار۔ وَین ہائس کا سرا کسی فریادی کے ہاتھ کی طرح اٹھا ہوا تھا۔ پروفیسر ڈونلڈ بیکر، ان کی بیگم کیرولن، پروفیسر محمد عمر میمن، تحسین صدیقی ان کے چہرے دیکھتے ہی رفاقت کے نرم لمس کا احساس ہوا۔

قیام کا انتظام یونین ساؤتھ میں کیا گیا جہاں وزیٹنگ پروفیسروں کے لیے ایک منزل مخصوص ہے۔ رہائش کے کمروں میں شاور سے لے کر ٹی وی، ریڈیو، فون، تمام ضروری چیزیں موجود تھیں اور آرائش و زیبائش سے سلیقہ جھلکتا تھا۔ نیچے کی منزلوں پر طلبا کے تفریحی مشاغل کے کمرے اور چھوٹے بڑے کئی ریستوراں تھے، صبح جب باہر نکلا تو کچھ دیر بھٹکتا رہا۔ چند ہی برسوں میں چیزیں اتنی بدل گئی تھیں کہ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کہاں ہوں، مجبوراً استقبالیہ سے نقشہ لیا۔ اور بازیافت کا سلسلہ شروع ہوا۔ الاماں، دس برسوں کے اندر اندر کیمپس کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ کتنے لینڈ مارک مٹ مٹا گئے تھے۔ یونین کی اصل عمارت جھیل کے کنارے تھی۔ یہ نئی عمارت انجینیرنگ کیمپس پر یونی ورسٹی ایونیو کے

نواح میں تھی۔ CHADBOURNE ہال کے سامنے کے پیڑ وہی تھے جہاں سردیوں میں برف باری کے موسم کے بعد یکلخت بہار انگڑائی لیتی تو سوکھی ٹہنیاں دیکھتے ہی دیکھتے پتوں کے ننھے ننھے سبز موتیوں سے بھر جاتیں۔ یہاں فرسٹ نیشنل کی دوسری منزل میں شعبۂ مطالعاتِ ہند کا دفتر ہوا کرتا تھا۔ اس عمارت کے کونے پر وہ بڑے بڑے ہاتھوں والی گھڑی تھی جو چاروں طرف سے دکھائی دیتی تھی۔ اب نہ فرسٹ نیشنل تھا نہ مطالعاتِ ہند کا دفتر، نہ گھڑی کے ہندسے نہ وقت کی وہ رفتار، ذرا آگے کو الویہجم آرٹ میوزیم کی نئی عمارت سفید پتھر میں ڈھلی ڈھلائی جھلملا رہی تھی۔ اطالوی کھانے کی جگہ پائے زان معدوم ہو چکی تھی۔ یہاں جرنلزم اور تھیٹر کے شعبوں کی نئی عمارتیں بن گئی تھیں۔ رکتا بڑھتا آگے آیا تو یونی ورسٹی اسکوائر کے نام سے ایک نئی دنیا آباد پائی۔ میری چہیتی براؤن بک شاپ، ڈاکخانہ، اطالوی پائے زان، فور تھیٹر یعنی چار فلمیں بیک وقت دکھانے والے سنیما گھر سب ہاتھ میں ہاتھ ڈالے یہاں موجود تھے۔ دوپہر کا کھانا تحسین صدیقی کے ساتھ طے تھا۔ انھوں نے بڑے بڑے ریستورانوں اور کھانے کی نئی نئی عمدہ جگہوں کے نام لیے لیکن مجھے للک تھی یونین کے کیفے ٹیریا میں جھیل کے کنارے بنچ پر بیٹھنے کی۔ جرمن بیئر میں نے اپنی مرضی سے لی۔ میلوں تک جھیل کا لہریں لیتا ہوا وہی پانی، وہی برقی کشتیاں، ڈوبتے اچھلتے نہاتے تیرتے ہوئے نوجوان لڑکے لڑکیاں۔ دیر تک ہم باتیں کرتے رہے۔ تحسین لسانیات میں ڈاکٹریٹ مکمل کرنے والے ہیں۔ ہسٹاریکل سوسائٹی اور میموریل لائبریری کے بیچوں بیچ بڑے لان کے وسط میں فوارہ پانی کے پھول برسا رہا تھا۔ حوض کے چاروں طرف سنگ مرمر میں لکھی ہوئی وہ عبارت پانی کی بوندوں میں اب بھی جوں کی توں چمک رہی تھی:

BOOKS ARE FOUNTAINS FROM WHICH FLOW THE WATERS OF KNOWLEDGE

بسیکم کی ڈھلان ختم ہوتے ہی اسٹیٹ اسٹریٹ شروع ہو جاتی ہے۔ یہ تمام

سرگرمیوں کا مرکز ہے اور اس لحاظ سے دانش گاہ کا دل ہے۔ کتابوں کی دکان جو COOP کہلاتی تھی، چرچ کے ساتھ والی نئی عمارت میں منتقل ہوگئی تھی اسٹیٹ اسٹریٹ مال میں تبدیل ہوچکی تھی، یعنی موٹروں اور ہر طرح کی آمد و رفت بند کی جا چکی تھی۔ اب یہ سارا علاقہ طلبا کی تفریح گاہ اور پیدل چلنے کا راستہ قرار دیا جا چکا ہے۔ جگہ جگہ بیٹھنے اور سستانے کے لیے بینچ اور رنگ دار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ پورا منظر نامہ بدل چکا تھا۔ بعض طالب علموں نے کھانے پینے کی چیزوں کے چھوٹے چھوٹے اسٹال کھول رکھے تھے۔ ایک اسٹال پر ہندوستانی مالائیں، دستکاری، اور ہینڈ لوم کی پوشاکیں نظر آئیں۔ ایک نیپالی خاتون نے سموسوں اور پکوڑوں کا اہتمام کر رکھا تھا۔ کہیں چائے، کہیں کافی، کہیں آئس کریم اور کہیں چینی، جاپانی چاپ سوئی اور اطالوی پی ٹزا فروخت ہو رہا تھا۔

میڈیسن میں میرا پروگرام یہ تھا کہ صبح نو بجے سے دوپہر کے کھانے تک پروفیسر بیکر کے ساتھ کام ہوتا تھا، اور سہ پہر اور شامیں ملنے ملانے اور تقریبات کے لیے تھیں۔ پروفیسر ڈونلڈ بیکر جرمن نژاد ہیں۔ شعبۂ جرمن میں پروفیسر ہیں۔ میرے رفیقِ دیرینہ ہیں اور اُردو کے بہت سے کام وِسکانسن میں میں نے ان کے ساتھ مل کر کیے۔ ہم دونوں کی ملاقات ایک عجیب حادثہ تھی۔ جان جو شواکیٹلر کی اولین ہندوستانی گرامر کے مخطوطے میں ہندوستانی الفاظ کے ڈچ مترادفات کے سلسلے میں میں ان تک پہنچا تھا اور پھر یہ اتفاقیہ ملاقات دائمی رفاقت میں تبدیل ہوگئی۔ اُردو اور ہندی کی صوتیات کے مختلف مسائل پر ہم نے مل کر کام کیا۔ ہکاریت اور غنیت پر ہمارا مشترکہ کام رسالہ لینگویج ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔ دو سال کے بعد بیکر ہندوستان آئے اور ہم نے ہندی اور اُردو میں معکوسیت کے مسئلے پر کام کیا جو رسالہ جرنل لنگوسٹکس میں ۱۹۷۴ء میں منظر عام پر آیا۔ چار سال کے بعد بیکر پھر ہندوستان آئے اور انھوں نے ریورس ڈکشنری کی تکمیل کا منصوبہ بنایا اور ہم دونوں نے اردو اشتقاقیات کے بڑے پروجیکٹ پر کام کرنا شروع کیا۔

اُردو کا یہ لغت، مردّف شائع ہوچکا ہے اور اشتقاقیات پر ہم دونوں کا کام جاری ہے۔ لمبی اونچی وین ہاؤس کی آٹھویں منزل پر بیکر صاحب کا دفتر ہے وہاں ہمارا کام جاری رہا اور دوست احباب سے ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں۔ گرمیوں کی چھٹیاں تھیں کئی حضرات وسکانسن سے باہر تھے لیکن بہت سے دوستوں کو اطلاع ہوگئی تھی اور وہ منتظر تھے۔ پروفیسر منیندر ورما کا شمار اعلا پایے کے ماہرینِ لسانیات میں ہوتا ہے وہ ہند آریائی اور نیپالی کے ماہر ہیں۔ برسوں وہ شعبۂ ہندیات کے صدر رہے ہیں۔ پروفیسر فرانسس ولسن سنسکرت پڑھاتی ہیں۔ نارائن راؤ تیلگو اور اوشا نیلن ہندی کی پروفیسر ہیں۔ اوشا ہندوستان گئی ہوئی تھیں باقی سب سے پروفیسر منیندر ورما کے یہاں عشائیہ میں ملاقات ہوگئی۔ ایک شام پروفیسر محمد عمر میمن کے لیے مخصوص تھی۔ ان کی جاپان نژاد بیگم اور بچّوں سے مل کر مسرت ہوئی۔ میمن صاحب اور ان کی بیگم نے خوش ذائقہ پنیر کے انتخاب سے لے کر فرنیچ ارغوانی تک ہر چیز کے انتخاب میں انتہائی نفاست اور سلیقہ مندی کا ثبوت دیا۔ ان لوگوں کے مکان صاف ستھرے علاقوں میں نہایت خوبصورت آبادیوں میں ہیں۔ سرسبز لان، جھکی ہوئی ڈالیاں، طرح طرح کے پھول اور دہکتے آنگن۔ ایک شام بیکر صاحب نے تمام احباب کو اپنے یہاں مدعو کیا۔ ہمارے تحقیقی پروجیکٹ کے کچھ کارڈ وغیرہ گھر پر تھے اور آنا جانا رہتا تھا۔ مسز بیکر بھی جرمن زبان کی پی ایچ۔ ڈی ہیں۔ گھر کی خوش وضعی کا یہ عالم کہ جگہ جگہ ایرانی قالین، دیواروں پر ہندوستانی باٹیک اور کانسے اور پیتل کے اجنتائی مجسمے۔ پورا مکان چھوٹا سا عجائب گھر معلوم ہوتا تھا۔ ڈرائنگ روم سے ذرا باہر بلی کی نشست تھی جس میں بڑی بی اپنی مرضی سے آتی جاتی رہتی تھیں۔ مطالعے کے کمرے میں بیکر صاحب نے چھوٹا کمپیوٹر نصب کر رکھا تھا۔ کمپیوٹر کے بھی اس عہد میں کیا کیا کمالات ہیں۔ ایک طرف INPUT ٹائپ رائٹر تھا۔ اس کے پیچھے برقی ذہن اور OUTPUT کے لیے سامنے ٹی وی اسکرین تھی۔ میں نے بیکر صاحب سے پوچھا آپ نے کمپیوٹر

کی تربیت کہاں سے حاصل کی - کہنے لگے اپنے طور پر کتابوں کی مدد سے۔ انھوں نے اس منی کمپیوٹر پر پروگراموں کے جو نمونے دکھائے تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اصلاً ان دنوں وہ کمپیوٹر کا استعمال جرمن زبان کی صوتیات و صرفیات کے اسباق تیار کرنے کے لیے کر رہے تھے جن کے لیے انھوں نے کچھ قوانین بھی وضع کر لیے تھے۔ وہ ان فارمولوں کو ٹائپ کرتے جاتے اور ان کے نتائج کے خوشے اور لڑیاں معاً قطار اندر قطار اسکرین پر آ جاتیں۔ ایک مزے کا پروگرام تحلیلِ نفسی کا تھا جسے پرنسٹن کے کسی ماہرِ نفسیات نے تیار کیا تھا۔ اس میں بڑے دلچسپ سوالات تھے اور بتدریج سوالوں کا دائرہ اتنا تنگ ہوتا جاتا تھا کہ بالآخر جواب خود بخود سامنے آ جاتا تھا - مجھ سے پوچھا گیا کہ کسی چیز کا تصور کیجیے - ہندوستان میں یونی ورسٹیوں کی زندگی میں جس نوعیت کے بعض کرداروں سے سابقہ رہتا ہے، میں نے یکلخت کئی جانداروں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ پھر پوچھا گیا کہ اس کے سینگ ہیں - میں نے کہا نہیں - پھر پوچھا گیا اس جاندار کی خوراک کیا ہے - وہ گوشت کھاتا ہے کہ گھاس، سواری کے قابل ہے کہ نہیں - دولتی جھاڑتا ہے، دودھ دیتا ہے وغیرہ وغیرہ - آخر میں کہا گیا کیا آپ نے گدھے جیسی کسی احمق چیز کے بارے میں سوچا تھا - جواب اثبات میں تھا۔ اسی طرح دوستوں، انسانی رشتوں، محبّت، نفرت، پسند ناپسند پر سینکڑوں سوال تھے جن کے میں جواب دیتا گیا۔ کچھ صحیح کچھ غلط عمداً تاکہ دیکھا جائے کہ کمپیوٹر سے چھیڑ چھاڑ کس حد تک ممکن ہے - بہر حال تقریباً گھنٹے بھر کی اس برقیاتی تحلیلِ نفسی کے بعد جو نتائج برآمد ہوئے، وہ اس قدر دلچسپ اور شوخ تھے کہ وہ تو اچھا ہوا کہ اس وقت کمرے میں ہنسنے والے ہم اکیلے تھے، اور بیگم بیکر قریب نہیں تھیں -

میڈیسن کا سفر بیکر صاحب کے ساتھ مل کر لسانیاتی پروجیکٹ مکمل کرنے کی غرض سے تھا۔ شعبے اور ایسوسی ایشن کی طرف سے لیکچر کی فرمائش ہوئی - لیکن

اگلے سال کے وعدے پر میں نے معذرت کرلی۔ اتفاق سے انہیں دنوں اسٹیٹ اسٹریٹ پر SOUTH ASIA FESTIVAL لگا ہوا تھا۔ چبوترے کے آس پاس ہائیڈ پارک کی سی کیفیت پیدا ہوچکی تھی۔ طلبا کے لیڈر اپنی اپنی سیاسی نیم سیاسی تقریروں میں مصروف تھے۔ مجمع لگا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد یہی چبوترہ ہندوستانی ساڑھیوں کے فیشن شو کے لیے استعمال ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مینا بازار لگ گیا۔ ہندوستانی کپڑے کی دکانیں، ساڑیاں، کتابیں، ستار، طبلے اور جانے کیا کیا۔ ساز سنگیت کتھک اور بھارت ناٹیم کا پروگرام بھی تھا لیکن اس شام بیکر اور ان کے احباب مجھے شیکسپیر کا ڈرامہ THE COMEDY OF ERRORS دکھانے لے جانے والے تھے۔ چار بجے ہم روانہ ہوتے کیونکہ اس پروگرام کا مقصد مضافات کی سیر کرانا بھی تھا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی نہایت خوشگوار مسافت کے بعد کھیتوں، پیڑوں، پہاڑیوں سے گزرتے ہوتے ہم ایک اونچی جگہ پر پہنچے۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی تھی۔ ہم نے بھی چھاتے کھول لیے۔ پہاڑی کی ڈھلان پر کم ازکم چار پانچ سو موٹریں قطاروں میں لگی ہوئی تھیں۔ یہاں تھیئٹر کی ایک شوقین کمپنی ہر سال گرمیوں میں شیکسپیر کے ڈرامے اسٹیج کرتی ہے۔ پہاڑیوں کے بیچوں بیچ ایک چھوٹی سی وادی میں AMPHITHEATRE بنا ہوا ہے۔ یہاں بڑے بڑے تختوں سے بنے ہوتے ایک تین منزلہ اسٹیج پر کھیل شروع ہوا۔ اداکاری اور زبان کے ماہرانہ استعمال کے ساتھ ساتھ پوشاکیں اور پہناوا بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ شیکسپیر کے لکھے ہوتے ایک ایک لفظ کو ان لوگوں نے جس طرح ادا کیا اور ڈرامے کے ہر ہر موڑ کو جس خوبی سے پیش کیا اس کی سب نے داد دی۔ وسکانسن میں گرمیوں کی رات دیر سے اترتی ہے۔ اندھیرا ہوتے ہوتے ہم گھر پہنچ گئے۔ اگلے دن روانگی تھی۔ تحسین صبح ہی سے میرے پاس آگئے تھے۔ میں نے شاپنگ تو کی نہیں تھی پیکنگ کی کھکھیڑ کیسی۔ سب کچھ تیار تھا۔ تھوڑی دیر میں بیکر صاحب اور ان کی بیگم بھی آگئیں۔ اور میں سب سے خدا حافظ کہتا ہوا دو بجے واشنگٹن کے لیے روانہ ہوگیا۔

سلور سپرنگ میری لینڈ

واشنگٹن میں گھر کا ماحول تھا، کچھ آرام کیا، اخبار رسالے دیکھے، کتابیں خریدیں، کچھ نئے بیلے، فلمیں اور ڈرامے دیکھے۔ یہاں کی بڑی دکانوں میں چین کا مال واسباب موجود تھا، ہندوستان کا سامان خال خال نظر آیا۔ البتہ نوجوانوں کی بوٹیک دکانوں میں ہندوستانی ہینڈ لوم کی رونق تھی۔ اس زمانے میں واشنگٹن پوسٹ میں ہندوستان کے بارے میں ایک معاندانہ فیچر شائع ہوا تھا۔ میں بار بار سوچنے پر مجبور ہوا کہ قطع نظر اس امر کے کہ مغربی ملکوں کا تمول اور افراطِ زر دراصل مشرق کے افلاس اور پس ماندگی کی دین ہے، صدیوں کی سامراجی پالیسیوں نے افریقہ اور ایشیا کو ایسا محتاج بنا کے رکھ چھوڑا ہے کہ ان کے لیے کوئی راہِ نجات دکھائی نہیں دیتی۔ جہازوں، راکٹوں اور فوجی ساز و سامان کی صنعتیں اربوں کھربوں کے منافع کی صنعتیں ہیں۔ یہاں کی پروڈکشن لائنز کو مصروف رکھنے کا ایک ہی راستہ ہے، مشرقی ممالک میں فوجی ساز و سامان کی کھپت اور استعمال۔ گویا مفاد پرستی اور منافع خوری کی اندھی دوڑ ہے جس میں سب لگے ہوئے ہیں۔ ویت نام میں کیا ہوا۔ ایران میں کیا سامنے آیا۔ اسرائیل کس کی شہ پر سب کچھ کرتا ہے۔ مغربی ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ میں کیا بھیانک کھیل کھیلا جارہا ہے۔ کیا جمہوری مملکتوں، فوجی ڈکٹیٹروں اور تعیش زدہ بادشاہوں میں کوئی فرق نہیں؟ جمہوریت کے دعویدار اور فرد کی آزادی کے موید جدید ہندوستان کے بارے میں خطرناک تعصبات کا شکار کیوں ہیں؟ اس لیے کہ ہندوستان سامراجی عزائم کا شدید مخالف رہا ہے۔ اصل چیز جمہوری نظام، ذہن و فکر کی آزادی، اور عوامی درد کا رشتہ ہے یا تاجرانہ منافع اندوزی جس کے لیے مجبوراً قدروں کو خیرباد کہنا پڑتا ہے اور ہر طرح کی سمجھوتے بازی سے کام لینا پڑتا ہے۔ دنیا کی سب سے طاقتور جمہوریت کی خارجہ پالیسی ہمیشہ آمرانہ نظاموں اور زنگ خوردہ بادشاہتوں کا ساتھ کیوں دیتی ہے؟ کیا دنیا کے انتہائی ترقی یافتہ سماج بھی دو سطحوں پر جیتے، دو ذہنوں سے سوچتے، اور دو زبانوں میں

بات کرتے ہیں - ہتھیاروں کی جنگ کیوں جاری ہے - ان ملکوں کی سیاست عالمی دانشوروں کی اس تنبیہہ پر کیوں کوئی توجہ نہیں کرتی کہ آخر ہم تباہی کی کس منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں - بارود کے ڈھیر پر یہ دنیا کب تک بیٹھی رہ سکتی ہے - یہ سب نہ بھی ہو تو بھی شمال کا تمول اور جنوب کا افلاس کب تک پہلو بہ پہلو چل سکتا ہے - بڑھتی ہوئی آبادی ، بے روزگاری ، جہالت اور ملکوں ملکوں پھیلی ہوئی بھوک ، کیا اس چمک دمک کو یوں ہی رہنے دے گی ؟

بعض کتابیں شہر کے بک اسٹور میں دستیاب نہیں ہوسکی تھیں - ان کا آرڈر دینے کے لیے میں UNIVERSITY OF MARYLAND پہنچا - کتابوں کی دکان میں کاؤنٹر پر نوخیز لڑکی کے پیلے بلاؤز پر سبز رنگ سے لکھا تھا :

I LOVE MARYLAND

انسان جب تک زندہ ہے محبت کرتا رہے گا - ایک دوسرے سے ، اچھی چیزوں سے ، خوبصورت دھرتی سے ، چاند ستاروں سے ، پھولوں پھلوں سے ، خواہ یہ چیزیں افراط کی دھرتی پر اُگیں یا افلاس کی سرزمین پر نظر آئیں - واشنگٹن کے مناظر میرے دیکھے ہوئے تھے ان میں میرے لیے کوئی نیا پن نہ تھا - البتہ ایک پورا دن میں نے SMITHSONIAN کے آرٹ کامپلکس میں صرف کیا جہاں کئی شاہکار نئے تھے - یہاں کا SPACE MUSEUM جو حال ہی میں مرتب کیا گیا ہے ، دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے - یہاں ان راکٹوں کے اصل MODULES رکھے ہیں جن میں انسان نے چاند پر پہلا قدم رکھا تھا - THE WONDER PLANET کے نام سے یہاں میں نے ایک چھوٹی سی خوبصورت فلم دیکھی - اس میں تصویرکشی کی کچھ ایسی تکنیک سے کام لیا گیا تھا کہ محسوس ہوتا تھا گویا ہم آسمان کی بلندیوں میں ہیں اور دریاؤں ، ندیوں ، نالوں ، پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں اور سمندروں کی نیلی وسعتوں کے عین اوپر پرواز کر رہے ہیں - یوں لگتا تھا کہ تینوں طرف پیڑ ہی پیڑ ہیں اور ہم سب سے اونچی ٹہنیوں کے اوپر ہی اوپر پھسلتے جا رہے ہیں - گرج ، چمک اور بجلی کا یہ عالم کہ کڑک سے دل دہلتا تھا اور

جل تھل کا سماں نظر آنے لگتا تھا۔ اس میں آسمان سے لی گئی تاج محل کی تصویریں عجیب و غریب کیفیت پیدا کرتی تھیں، اور راجستھان کے ریگستانوں میں میلوں تک پھیلی ہوئی اونٹوں کی قطاریں، اور انسان کا دھرتی کی سوکھی کوکھ سے پانی کی ایک ایک بوند کو حاصل کرنا دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ چاند سے نیچے دیکھنے پر یہ کرۂ ارض، ہماری حسین دنیا، لازماں خلا کی اتھاہ تاریکیوں میں لپٹی آدھی نارنجی آدھی نیلی گولا سا گھومتی معلوم ہوتی تھی۔

سیرِ شبِ لامکاں اور میں
ایک ہوتے رفتگاں اور میں
سانس خلاؤں نے لی سینہ بھر
پھیل گیا آسماں اور میں (باقی)

بھائی صاحب، بھابی صاحبہ، ڈاکٹر انل، ڈاکٹر کیلاش، ڈاکٹر چوپڑا، انیتا، کامنی اور چھوٹے سنیل نے مجھے آرام پہنچانے کے لیے کیا کچھ نہ کیا، اور میرے لیے کیا کیا زحمتیں برداشت کیں، اس سب کے ذکر کے لیے ایک دفتر کی ضرورت ہے۔

یخ بستہ زمین گرم جوش انجمن

۴ راگست کو میں دوبارہ ٹورنٹو پہنچا۔ ارون کو بے حد خوشی ہوئی۔ دیر تک میں اسے گلے لگائے رہا۔ شام کو ارون کا اصرار تھا کہ میں اس کے ساتھ اس کے دوستوں کی پارٹی میں چلوں۔ ڈِسکو کا ایسا شور تھا کہ کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ بہرحال جسم کی سطح پر جلنے جلانے کی یہ بھی ایک سزا تھی۔ ارون کو خوشی ہوئی کہ میں اس کے دوستوں سے مل سکا۔ ہنسی مذاق قہقہوں کے پھول باتیں جیتیں۔ اس رات بہت دیر تک ہم باہر گھومتے رہے۔

اگلے دن صبح صبح کرنل انور احمد کا فون آیا کہ VOICES OF ASIA پروگرام کے لیے انٹرویو کی ریکارڈنگ ٹیلی ویژن والے آج ہی کرنا چاہتے ہیں آپ کو کس وقت

سہولت ہوگی - چار بجے کا وقت طے ہوگیا - ہربنس لال نارنگ جنھیں کسی زمانے میں
مزید تعلیم کے لیے میں نے وِسکانسن بھیجا تھا ان کا فون رَس کا چواں سے آیا - وہ
ریجائنا یونی ورسٹی کے شعبۂ تعلیم میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں اور مزے میں ہیں - دوپہر
کا وقت میں نے ایک بُک اسٹور میں گزارا - بے اسٹریٹ کے کنارے ایک نہایت
اونچی عمارت کی آخری منزل میں جنتِ نگاہ، فردوس گوش کی سی کیفیت تھی - یہاں بیٹھ کر
اطمینان سے چاروں طرف ٹورینٹو پر نظر ڈالی - دور اُس جھیل کا پانی چمک رہا تھا
جہاں نیویارک اسٹیٹ کی حد ختم اور کینیڈا کی حد شروع ہوتی ہے - شام میں ریکارڈنگ
تھی - ٹیلی ویژن اسٹوڈیو ایک پرائیویٹ عمارت میں تھا - پروڈیوسر نے بتایا کہ ٹورینٹو
ٹی وی سے کئی ایشیائی زبانوں میں پروگرام نشر ہوتے ہیں - آدھے گھنٹے کا اُردو پروگرام
جو ہر اتوار کو دکھایا جاتا ہے اسی کا حصہ ہے - تھوڑے دنوں میں جمیل الدین عالی،
قتیل شِفائی، پروین فنا سید، حمایت علی شاعر، سید محمد جعفری اور کچھ دوسرے
حضرات ٹورینٹو پہنچنے والے تھے - مشاعرے کا اعلان ہو رہا تھا - جاتے ہی ریکارڈنگ
شروع ہوگئی - ہمارے یہاں ریکارڈنگ کے لیے ایک پوری خلقت عذاب میں مبتلا
کی جاتی ہے - وہاں کُل دو آدمیوں نے پورا پروگرام ریکارڈ کر لیا - فلور منیجر کے آنے
میں دیر ہوئی تو اس کے فرائض اروِن نے انجام دیے - کرنل صاحب نے دلچسپ
سوالات پوچھے، لسانی، ادبی، سماجی، ہندوستان پاکستان سے باہر بسنے والوں کے
ادبی مشاغل اور اُردو کا چلن بھی زیر بحث آیا - ریکارڈنگ کے بعد جب وی ٹی آر
دوبارہ چلایا گیا تو مجھے خدشہ تھا کہ رنگین ریکارڈنگ تو خاصا پیچیدہ کام ہوگا اور یہاں
صرف دو آدمی - خدا جانے کیا نتیجہ سامنے آئے - لیکن جب دیکھا تو دنگ رہ گیا -
ایسی صاف اور عمدہ فلم تھی کہ باید و شاید - پروڈیوسر نے کہا امید ہے آپ اس
کی اجازت دیں گے کہ اگر ضرورت ہو تو ہم اسے ایک سے زیادہ بار دکھا سکیں -
انور صاحب نے کہا یہاں وی ٹی آر کی کاپی آسانی سے بن جاتی ہے - میں بعد
میں دہلی بھجوا دوں گا -

انجمنِ اُردو کینیڈا حفظ الکبیر قریشی کی کوششوں سے قائم ہوئی ہے۔ یہاں اُردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ موجود ہے۔ یہ ہر مہینے جلسے کرتے ہیں، شعر و شاعری کی نشستیں ہوتی ہیں، اُردو پڑھانے کی باقاعدہ جماعتیں بھی ہوتی ہیں اور کبھی کبھی خاص پروگرام بھی منعقد کیے جاتے ہیں۔ کینیڈا کی انجمن اُردو در اصل ان لوگوں کے دم قدم سے آباد ہے جو ۷۰-۱۹۶۰ء کے بعد یہاں آکر بسنا شروع ہوئے۔ ان میں اور پہلے کے آباد کاروں میں خاصا فرق ہے۔ یہ تقریباً سب کے سب اعلا تعلیم یافتہ ہیں، ان میں انجینئر بھی ہیں، ڈاکٹر بھی اور بزنس کمپنیوں میں کام کرنے والے بھی۔ اگرچہ کاروبار کی زبان انگریزی ہے، لیکن یہ اُردو سے اور اپنی تہذیب سے رشتہ بنائے رکھنا چاہتے ہیں، اور اپنی ثقافتی میراث کے تئیں خاصے حساس ہیں۔ پروفیسر عزیز احمد مرحوم کی ذات یہاں ٹورنٹو یونی ورسٹی میں اُردو والوں کے لیے مرکز و محور کا درجہ رکھتی تھی۔ ۱۹۶۵ء میں محمد حفظ الکبیر قریشی شکاگو سے ٹورنٹو آگئے اور اُردو والوں کو مجتمع کرنے کے جتن کرتے رہے۔ انجمنِ اردو کینیڈا انھوں نے اور ان کے احباب نے ۱۹۷۸ء میں تشکیل دی، اور ۱۹۸۰ء سے اس نے باقاعدہ کام کرنا شروع کر دیا۔ اب اس کی نشستیں ہر ماہ منعقد ہوتی ہیں، مقامی شعرا اور ادیب اپنی تازہ تخلیقات پیش کرتے ہیں جن پر بحث و تنقید کی جاتی ہے۔ جب کوئی نئی کتاب یا رسالہ آتا ہے تو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے اور ایک گھر سے دوسرے گھر منتقل ہوتا رہتا ہے۔ انجمن کی سرگرمیوں سے ایسی فضا بن گئی ہے کہ خاص خاص جلسوں کے لیے لوگ ہفتہ اتوار کو دور دراز علاقوں سے سینکڑوں میلوں کا سفر طے کر کے ٹورنٹو پہنچتے ہیں اور شعرا کے کلام سے محظوظ ہوتے ہیں۔ محمد حفظ الکبیر قریشی نے "بازگشت" کے نام سے امریکی شعرا کا انتخاب تیار کیا ہے اور کئی اُردو شعرا کی نظموں کے انگریزی تراجم بھی کیے ہیں۔ انجمن کے پہلے صدر محمد حفظ الکبیر قریشی ہی تھے۔ موجودہ صدر بیدار بخت ہیں اور سکریٹری کرنل انور احمد۔ انجمن کے انتخابات ہر سال ہوتے ہیں اور نئے عہدہ دار چنے جاتے ہیں۔

انجمن کی طرف سے اعلان نکل چکا تھا کہ میرا لیکچر ۷ر اگست کو ہوگا۔ شام کا کھانا ہم سب نے قریشی صاحب کے مکان پر کھایا۔ ڈون ملز انٹیریو میں ایک خاص گوشہ ہے۔ بیدِ مجنوں کی جھکی ہوئی شاخوں اور خوبصورت پیڑوں سے گھرے ہوتے قریشی صاحب کے مکان میں داخل ہوتے ہی اپنائیت کا احساس ہوا۔ کھانے سے فارغ ہوکر جب ہم یونی ورسٹی آف ٹورینٹو کے انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن میں پہنچے تو اوپر کے ہال اور لابی میں لوگوں کی ریل پیل تھی۔ شائقینِ ادب اور مقامی شاعر، ادیب بڑی تعداد میں تشریف رکھتے تھے۔ یونی ورسٹی کے طلبا اور طالبات کے علاوہ ہندوستانی اور پاکستانی خواتین و حضرات اور غیر ملکیوں کی بھی ایک بڑی تعداد نظر آئی۔ استقبالیہ تقریر قریشی صاحب نے کی۔ میرے لیکچر کا موضوع تھا" آزادی کے بعد ہندوستان پاکستان میں اردو افسانے کا جزر و مد"۔ ایک گھنٹے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ گھڑی دیکھ کر جب میں نے تقریر ختم کی تو لوگوں کا کہنا تھا کہ اگر لیکچر گھنٹوں جاری رہتا تو بھی ہم اسی انہماک سے سنتے رہتے۔ تعریف و تحسین کا سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ چائے، کافی کے وقفے میں سینکڑوں اہلِ کینیڈا سے ملنا ملانا رہا۔ اس کے بعد شعری نشست ہوئی جس میں بیس سے زیادہ مشّاق سخن گویوں نے اپنے کلامِ بلاغت نظام سے نوازا اور ٹورینٹو کی تاریخ میں وہ شام اُردو کی شام کے طور پر رقم ہوئی۔

اگلے روز غیر رسمی نشست کا پروگرام تھا اور چند مقامی صحافی انٹرویو ٹیپ کرنا چاہتے تھے۔ شام میں ارون کے دوست پیٹر اور ری بیکا کی شادی کا استقبالیہ تھا۔ ارون کی حیثیت BEST-MAN کی تھی اس نے اس موقع کے لیے ایک دلچسپ تقریر تیار کی تھی۔ میری خواہش تھی کہ سب کی خوشی میں شریک ہوں۔ لیکن فضائی کنٹرولرز کی غیر متوقع اسٹرائک نے سارا پروگرام درہم برہم کردیا۔ صبح سویرے ری پبلک والوں کا فون آیا کہ چونکہ دس اگست کو آپ کو واشنگٹن سے لندن کے لیے روانہ ہونا ہے اور نو کو ٹورینٹو سے واشنگٹن جانے والی تمام پروازیں منسوخ

ہوگئی ہیں، اس لیے آج ہی آپ کو خاص فلائٹ سے واشنگٹن بھجوا سکتے ہیں۔ مجبوری ایسی تھی کہ سب سے معذرت کرنی پڑی۔ اسی رات ایولن اور اس کی والدہ کا فون آیا اور دیر تک بات ہوتی رہی۔ میں نے بطورِ خاص ان سے معذرت کی۔ قریشی صاحب اور دوسرے احباب سے بھی معافی چاہی اور پیٹر اور ری بیکا کو تقریباً آدھی رات کو فون کیا۔ شادی کی مبارکباد دی اور استقبالیہ میں شریک نہ ہوسکنے کی معذرت کی۔ اس طرح اروِن، ٹورنٹو اور اہلِ ٹورنٹو کو خدا حافظ کہتے ہوئے میں صبح چھ بجے کی پرواز سے واشنگٹن کے لیے روانہ ہوگیا۔

اگلا دن تیاری میں گزرنا ہی تھا۔ فضائی کنٹرولروں کی وجہ سے صورتِ حال خاصی غیر یقینی تھی۔ اُس وقت تک تمام بین الاقوامی فلائٹ آگے پیچھے نکل رہی تھیں۔ لیکن دس اگست کو معلوم ہوا لندن کی فلائٹ آٹھ دس گھنٹے دیر سے آئے گی کیونکہ جو جہاز جانے والا تھا وہ ابھی لندن ہی سے روانہ نہیں ہوسکا۔ ڈلس ایئر پورٹ کا نقشہ بالکل دوسرا ہے۔ یہاں سے صرف بین الاقوامی فلائٹ روانہ ہوتی ہیں۔ نیویارک یا شکاگو والا ہنگامہ یا ریل پیل یہاں نہیں۔ زمین سے چپکی ہوئی ایک منزلہ عمارت ہے۔ جہاز برآمدوں سے منہ لگا کر بھی کھڑے نہیں ہوتے۔ بسوں میں ڈھوتے جانے پر بے اختیار پالم کی یاد آئی۔ لیکن انتظام کچھ ایسا تھا کہ ایک ہی بس جو اندر سے سیاہ تھی سینکڑوں لوگوں کو ڈھوکے لے گئی۔ اور یوں آٹھ گھنٹے کی تاخیر سے نصف شب گزر جانے کے بعد میں نے سب سے اجازت چاہی۔ الوداع، الوداع۔ واشنگٹن کی روشنیاں معدوم ہوتی گئیں اور ستاروں کی ہم سفری میں سمندر کے سینے پر سوار یہ قافلہ لندن کی سمت روانہ ہوا۔

بہر سو رقصِ بسمل

لندن اُردو کا نیا گہوارہ

جس دن لندن پہنچا، موسم خلافِ معمول صاف تھا۔ ہلکی ہلکی گرمی تھی، اتنی کہ تھوڑی دیر کو کوٹ آتار دینا پڑا۔ فضائی کنٹرولروں کی ہڑتال کی وجہ سے پرواز آٹھ نو گھنٹے لیٹ تھی۔ ساقی فاروقی نے سوچا ہوگا اب جہاز کیا آئے گا۔ موصوف سے بعد از سعیِ بسیار کیلی ڈونیا ٹرمینل پر ملاقات ہوئی۔ وہی مسکراتا چہرہ، چمکتی آنکھیں اور زور دار قہقہہ۔ بغلگیر ہوتے ہی بولے یار آپ کی فلائٹ نے سارا پروگرام چوپٹ کر دیا۔ پہلے افتخار عارف کو فون کیجیے، ان کے ساتھ آپ کو آج شام برمنگھم پہنچنا تھا بی بی سی ٹیلی ویژن ریکارڈنگ کے لیے، وہ الگ پریشان ہوگا۔ میں نے کہا میں رات بھر کا تھکا ہوا ہوں، اس وقت تو جتنی جلدی ہو سکے گھر چلو، وہاں سے جس کو چاہو گے فون کر لیں گے۔ ساقی نے اپنے گہرے سرخ رنگ کی وولوو میں بیٹھتے ہی میری جغرافیائی تربیت شروع کر دی، آبادیاں اور علاقے سمجھاتے رہے، بیچ بیچ میں کوئی لطیفہ، قہقہہ، طنز، استہزا، کبھی کوئی اچھا شعر، غرض یہ محسوس ہی نہ ہونے پایا کہ ساقی شہر کے مرکز سے جنوب مغرب میں کتنی دور رہتے ہیں۔ مکان تو اچھا خاصا تھا لیکن معماروں، مزدوروں نے حلیہ خراب کر رکھا تھا۔ ساقی پہلے ہی بتا چکے تھے کہ موسم سے فائدہ اٹھا رہا ہوں، کچھ مرمت اور توسیع کا پروگرام ہے، گرمیوں

میں نمٹ جائے تو اچھا ہے۔ بیوی اور بچی آسٹریا گئی ہوئی تھیں اور مطلع صاف،
گویا گرجنے برسنے والوں کی عدم موجودگی سے ساقی فائدہ اٹھا رہے تھے۔ باہر پتھروں
ٹائلوں اور عمارتی سازو سامان کا یہ حال تھا گویا بکنگھم پیلیس کا باورچی خانہ یہیں تعمیر
ہورہا ہو۔ ہمارے پہنچتے ہی چھوٹی سی ایک خوبصورت بلّی لان کی منڈیر پر آکر بیٹھ گئی۔
تھوڑی دیر میں ایک کالا بلاّ نمودار ہوا اور چھڑی کی طرح دم اٹھائے نہایت بے اعتنائی
سے گزر گیا۔ ساقی نے اپنے خاندان کے معزز اراکین سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا
یہ میکسی ہے، سالا بدمعاش مُنسی کے حصّے کا دودھ بھی پی جاتا ہے۔ مُنسی نے خفیف
سی میاؤں کی اور ساقی کی کالی پتلون سے پیٹھ کھجانے لگی۔ گھر کا تالا بند تھا لیکن میکسی
اور مُنسی فرشتوں کی طرح آجا رہے تھے، میں نے ادھر ادھر دیکھنا چاہا تو ساقی نے
کہا کہ اُدھر پیچھے کی طرف کچن میں CAT DOOR ہے، وہاں سے یہ داخل ہوجاتے ہیں۔
آئیے پہلے آپ کو کچھوے سے ملاؤں، کیا حسین جانور ہے۔ سامان بعد میں رکھ
لیں گے۔ بائیں باغ کے بیچوں بیچ لوہے کے ایک ننھے سے کٹہرے میں ساقی
نے جب ایک غار میں ہاتھ ڈالا تو ایک ملگجی سی زردی مائل چیز برآمد ہوئی۔ ساقی
نے پچکارا، ساتھ ہی کچھ اپنی شاعری کی مخصوص آوازیں نکالیں تو کچھوے سے ملتی جلتی
کسی چیز نے سر باہر نکالا اور گردن گھما کر کھلی فضا اور چمکیلی دھوپ کی داد دینے لگا۔
ساقی نے کہا برادرم یہ کائنات صرف انسانوں ہی کے لیے نہیں، سب جانداروں
کے لیے ہے۔ بعض جانور انسان سے بھی زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ اور انتہائی وفادار
بھی۔ میں نے کہا جی ہاں تبھی تو پچھلے سال آپ نے لکھا تھا کہ دو کچھوے کٹہرا توڑ کر
بھاگ گئے۔ ساقی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا شاید کوئی کچھوی نظر آگئی ہوگی۔

رات کو زہرہ نگاہ اور ماجد علی کے یہاں جانے کا پروگرام تھا، فیض احمد فیض
انھیں کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ افتخار عارف سے بھی ساقی نے کہہ دیا تھا کہ
وہاں آجائیں۔ زہرہ نگاہ کو میں مدت سے جانتا ہوں، کچھ عرصہ پہلے ان کا مجموعہ
"شام کا پہلا تارا" مکتبہ جامعہ سے نکلا تھا۔ زہرہ مرکزی لندن کے ایک نہایت ہی

فیشن ایبل علاقے میں رہتی ہیں۔ ان کے میاں ماجد علی ابوظہبی کے شیخ کے مالی مشیر ہیں۔ فلیٹ کا محل وقوع اور آرائش وکشادگی دیکھ کر دل خوش ہوا۔ دہلی میں بعض اردو والوں کے ذہنی امراض کے لیے زہرہ کے فلیٹ کی زیارت نسخۂ شفا کا کام دے سکتی ہے۔ فیض حسبِ معمول محبّت سے ملے اور سب کی خیریت معلوم کی۔ افتخار عارف ایک باسلیقہ، خوش مذاق شخص نظر آئے۔ بیرسٹر بشیری سے بھی اسی محفل میں ملاقات ہوئی۔ ماجد علی اصلاً بدایوں کے ہیں۔ ان کی بذلہ سنجی کا بھی اندازہ ہوا۔ دیر تک شعر و شاعری کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ بیچ بیچ میں ماجد علی اساتذہ کے بامزہ اشعار بھی سناتے رہے۔ فیض سے کچھ نجی باتیں ہوئیں، کچھ دوست احباب کا ذکر اذکار، کچھ نئے پرانے شاعروں کی باتیں۔ فیض کم بولتے ہیں، لیکن ان کی گفتگو محبّت آمیز ہوتی ہے۔ افتخار عارف کو کہیں دوسری جگہ جانا تھا، وہ جلدی چلے گئے۔ ساقی کی فرمائش پر پہلے زہرہ نگاہ نے پھر فیض نے اپنا کلام سنایا۔ میں نے کہا بیروت کے زمانے کی کوئی تازہ نظم ارشاد ہو۔ فیض نے "عشق اپنے قیدیوں کو پابجولاں لے چلا" سنائی، جو سب کو پسند آئی۔

عشق اپنے قیدیوں کو پابجولاں لے چلا

دار کی رسیوں کے گلو بند
گردن میں پہنے ہوئے
گانے والے ہر اک روز گاتے رہے
پائلیں بیڑیوں کی بجاتے ہوئے
ناچنے والے دھومیں مچاتے رہے
ہم جو اس صف میں تھے اور نہ اس صف میں تھے
راستے میں کھڑے ان کو تکتے رہے
رشک کرتے رہے

اور چپ چاپ آنسو بہاتے رہے
لوٹ کر آکے دیکھا تو پھولوں کا رنگ
جو کبھی سرخ تھا زرد ہی زرد ہے
اپنا پہلو ٹٹولا تو ایسا لگا
دل جہاں تھا وہاں درد ہی درد ہے
تھا گلے میں کبھی طوق کا واہمہ
اور کبھی پاؤں میں رقص زنجیر کا
اور پھر
ایک دن عشق انھیں کی طرح
رسن در گلو پا بجولاں ہمیں
پھر اسی قافلے میں کشاں لے چلا

سب کے اصرار پر انھوں نے یہ نئی غزل بھی سنائی:

دربار میں اب سطوتِ شاہی کی علامت
درباں کا عصا ہے کہ مصنف کا قلم ہے
آوارہ ہے پھر کوہِ ندا پر جو بشارت
تمہیدِ مسرت ہے کہ طولِ شب غم ہے
جس دھجی کو گلیوں میں لیے پھرتے ہیں طفلاں
یہ میرا گریباں ہے کہ لشکر کا علم ہے
جس نور سے ہے شہر کی دیوار درخشاں
یہ خونِ شہیداں ہے کہ زرخانۂ جم ہے
حلقہ کیے بیٹھے رہو اس شمع کو یارو
کچھ روشنی باقی تو ہے ہر چند کہ کم ہے

ناردے جانے کی تاریخوں کا تعین میں نے ساقی پر چھوڑ دیا تھا۔ اصلاً اوسلو

کے لیے چار دن رکھے تھے لیکن مصیبت یہ آن پڑی کہ اتوار سے اِدھر اُدھر تین تین دن رکنا ضروری ہوگیا۔ نتیجتاً لندن کا قیام کچھ مختصر کرنا پڑا۔ دوسرے دن PICCADILLY پر افتخار عارف کے شاندار دفتر میں پہنچا۔ تھرڈ ورلڈ فاؤنڈیشن کا اردو مرکز جس کے وہ سکریٹری ہیں، مرکزی لندن میں نہایت موقع سے ہے۔ لائبریری زیرِ تکمیل نظر آئی۔ افتخار عارف خوش فکر شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں کے LP ریکارڈ روشن آرا بیگم، نورجہاں، مہدی حسن کے گائے ہوئے ہیں۔ کسی زمانے میں کراچی ٹیلی ویژن سے ان کا کسوٹی پروگرام بہت مشہور تھا۔ تھوڑی دیر میں فیض صاحب بھی اردو مرکز تشریف لے آئے۔ فیض صاحب کے کلام پر مبنی جو LP ریکارڈ حال ہی میں EMI پاکستان نے ریلیز کیا ہے، افتخار عارف نے اس کی چند کاپیوں پر فیض سے دستخط لیے اور ایک کاپی مجھے عنایت فرمائی۔ تھوڑی دیر پہلے ہم الطاف گوہر سے ملنے گئے تھے۔ بی سی سی آئی کے اربابِ حل و عقد نے جو تھرڈ ورلڈ فاؤنڈیشن قائم کی ہے، الطاف گوہر اس کے ایک سربرآوردہ عہدے دار ہیں، ن۔م۔راشد اور میراجی کی صحبتوں کا فیض اٹھائے ہوئے اور حلقۂ اربابِ ذوق کے بنیادی رکن۔ الطاف گوہر اب شعر نہیں کہتے۔ دوپہر کا کھانا ہم سب نے مل کر قریب کے ایک ہندوستانی ریستوراں "آکاش" میں کھایا۔ بعد میں اردو مرکز میں اطہر راز تشریف لے آئے جو لندن کی کسی درس گاہ میں ریاضی کے استاد ہیں، اردو میں نظمیں کہتے ہیں اور جنگ انٹرنیشنل میں کالم لکھتے ہیں۔ بلونت کپور سے بھی یہیں ملاقات ہوئی۔ تھوڑی دیر میں سوہن راہی آگئے۔ پھر ڈاکٹر ضیاءالدین شکیب بھی تشریف لے آئے جو ان دنوں لندن یونی ورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز کے شعبۂ ہندیات میں "مغلوں کے عہدِ حکومت میں مندروں کا نظم و نسق" پر تحقیق کر رہے ہیں۔ سوہن راہی پریم وار برٹنی کے شاگرد ہیں۔ ان کی نظموں اور گیتوں کے کئی مجموعے نکل چکے ہیں۔ ان تینوں کے ساتھ میں لندن یونی ورسٹی چلا آیا، یہاں اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے بالآخر ہم DILLONS پہنچ گئے۔ ایک مدت سے مجھے اس دکان پر آنے کا اشتیاق تھا۔ اس میں کتابوں کے

سینکڑوں شعبے ہیں اور ہر شعبے میں نئی پرانی ہزاروں کتابیں ترتیب سے ردیف وار رکھی ہوئی ہیں۔ ادبیات، سماجیات، لسانیات، ان شعبوں کو دیکھتے دیکھتے شام ہوگئی۔ کچھ کتابیں جن کی مجھے تلاش تھی مل گئیں جو نہیں ملیں ان کے لیے آرڈر فارم بھر دیا۔ حساب چکایا تو معاملہ سو پونڈ سے بھی زیادہ کا تھا۔ میری جیب خالی ہوگئی تو یارانِ طریقت آڑے آئے۔ چند روز کے تجربے سے معلوم ہوا یہ حضرات لندن میں خضرِ راہ کا درجہ رکھتے ہیں، یہ میری مدد نہ فرماتے تو مجھ جیسا اجنبی ان راہوں میں مارا گیا ہوتا۔

لندن میں بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس انٹرنیشنل BCCI بہت بڑی چیز ہے۔ افتخار عارف بھی اصلاً اسی سے وابستہ ہیں اور ان کی خدمات اردو مرکز کو مستعار دی گئی ہیں۔ آغا حسن عابدی پاکستان کے بینکنگ جینیس کہے جاتے ہیں۔ یہ بینک جس کی شاخیں لندن کی ہر شاہراہ اور ہر موڑ پر مجھے نظر آئیں اور جو مشرق وسطیٰ میں بھی اتنی ہی بڑی تعداد میں ہوں گی، انھیں عابدی صاحب کے ذہن و تخیل کا کرشمہ ہے۔ مشتاق احمد یوسفی، الطاف گوہر اور ابنِ حسن برنی جو BCCI سے متعلق ہیں، انھوں نے مل کر طے کیا کہ لندن میں اردو اخبارات و رسائل اور کتب کی فراہمی کی کوئی صورت ہونی چاہیے تاکہ لوگ ان سے استفادہ کر سکیں۔ بالآخر تھرڈ ورلڈ فاؤنڈیشن کے منیجنگ ڈائرکٹر ہمایوں گوہر نے اس کو عملی شکل دے دی۔ ۱۹۸۱ء میں اردو مرکز نے کام کرنا شروع کر دیا اور افتخار عارف کو اس کا اعزازی سکریٹری بنایا گیا۔ یوں تو لندن میں کئی ادبی انجمنیں ہیں جو اردو کے لیے خاصا کام کر رہی ہیں۔ لیکن اردو مرکز کا قیام علمی اور تحقیقی کام کو آگے بڑھانے اور اردو کے لیے برطانیہ میں ایک مضبوط پلیٹ فارم فراہم کرنے کے لیے عمل میں آیا ہے۔ اس کے تحت بڑے پیمانے پر ادبی تقریبات منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ ۲۵ر اگست کے لیے میرے پروگرام کا اعلان کر دیا گیا۔ مجھ سے پہلے پروفیسر انا ماریہ شمل، فیض احمد فیض، پروفیسر رالف رسل اور جناب سبطِ حسن کے توسیعی خطبات ہو چکے تھے۔

اگلے دن ہندوستان کے ہائی کمشنر ڈاکٹر سیّد محمد سے ملاقات مقرر تھی۔ وہیں انڈیا ہاؤس کے ساتھ ہی بی بی سی کا دفتر ہے۔ یہاں اطہر علی سے جو پاکستانی

سروس میں کام کرتے ہیں، اور دیگر احباب سے ملاقات ہوئی۔ نیچے اتر رہے تھے تو یاور عباس دکھائی دیے۔ بی بی سی کے لیے انھوں نے ہندوستان پر جو فلم بنائی تھی، وہ خاصی بحث خیز ثابت ہوئی تھی۔ میسر ببر علی انیس کے پڑپوتے، وضع قطع، لہجے اور گفتگو میں ایسی دل نوازی اور شائستگی کہ یوں محسوس ہوا گویا کسی چمن میں ایک ساتھ کئی پھول کھل اٹھے ہوں۔ کہنے لگے پرسوں آکسفورڈ میں آپ کے اعزاز میں تقریب ہے، اس میں میں اور میری بیگم حاضر ہوں گے، تفصیلی ملاقات ہوگی۔ وہیں گراؤنڈ فلور پر بی بی سی کلب ہے جو ملنے ملانے اور پروگرام طے کرنے لیے بہترین جگہ ہے۔ یہاں کیسے کیسے لوگوں سے ملاقات ہوئی، رما پانڈے جنھیں پانچ چھ سال پہلے میں نے لکھنؤ اور پھر دہلی ٹیلی ویژن کے لیے پروڈیوسر منتخب کیا تھا، اب بی بی سی کی ہندوستانی سروس میں کام کرتی ہیں۔ اچلا شرما، آل انڈیا ریڈیو کی مشہور آواز کی خدمات حال ہی میں بی بی سی نے چند برسوں کے لیے مستعار لی ہیں۔ یہ سب لوگ اپنے اپنے خیابان میں چہکتے ہوئے نظر آئے۔

گھر پہنچے تو ساقی بہت سے ٹیلی فون نمبروں کے درمیان بیٹھے پریشان نظر آئے کہنے لگے یار تمھارے عاشقوں نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ فون پر فون، میں تو اپنی بلیوں اور کچھوے کو آرام سے کھانا تک نہیں کھلا سکا۔ کچھ معلوم ہے کل کیا ہوا، کچھوا تو صرف کیلے اور سلاد کے پتے کھاتا ہے۔ کل میں اسے سلاد کے پتے کھلانا بھول گیا۔ دفتر میں یاد آیا تو فوراً لوٹی کو فون کیا کہ بھئی تم مکان کی مرمت میں مصروف تو ہوگے لیکن کچھ نیکی کا کام بھی کرو تھوڑے سے سلاد کے پتے لا کے کچھوے کو کھلا دو۔ ساقی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا یار پتہ ہے لوٹی نے کتنے کا بل دیا—— دس پاؤنڈ! GOOD HEAVENS اس کے بعد موٹی سی گالی۔ ساقی کی گفتگو میں چھوٹی بڑی گالیاں اس روانی سے آتی ہیں جیسے پابند شاعری میں ردیف وقافیہ۔ ساقی کا گھر بڑی مزے کی جگہ ہے۔ مغرب کے گھر میرے لیے نئے نہیں ہیں لیکن ساقی کے گھر کا اپنا ایک کردار ہے۔ طرح طرح کے عجائباتِ روزگار،

سوکھے سڑے پتے، برسوں کی مری ہوئی بیلیں، نئے پرانے کارڈ جو نوادر بن چکے ہیں، پرانے کلنڈروں کے اوراق، بیتے ہوئے برسوں اور مہینوں کی تاریخیں جو گیگوں پہلے نمٹ چکیں، طرح طرح کی گڑیاں اور پرانی دُھرانی تصویریں، اِدھر اُدھر جہاں تہاں چیزیں، جگہ جگہ چیزیں اتنی چیزیں کہ کبھی کبھی چیزوں کے لیے راستہ چھوڑ دینا پڑتا تھا۔ ان سب پر ساقی کا وہی قہقہہ۔ یار اس گھر میں ... سب پرانی چیزیں ہیں، اس گھر میں نئی چیز بس میں ہی ہوں۔

ساقی کی بیوی گنڈی کی تعریف میں نے سب دوستوں سے سنی کہ وہ عجیب و غریب خاتون ہیں، خوش اخلاق، خوش اطوار، سگھڑ اور سلیقہ شعار۔ ساقی ان کو طرح طرح کے سرپرائز دیتے رہتے ہیں۔ شاعروں اور ادیبوں کے دوستوں سے خدا سب کے گھروالوں کو محفوظ رکھے۔ بیچاری بھلی ہوں گی نبھی تو بلی اور کچھوے کے علاوہ بھانت بھانت کے اُردو والوں کو گھر میں آنے دیتی ہوں گی۔

ساقی کی بیٹی اِنگے بنی اسکول میں پڑھتی ہے، وہ بھی ماں کے ساتھ آسٹریا گئی ہوئی تھی۔ دونوں سے آئے دن صبح سویرے فون پر بات ہوتی تھی اور دونوں کا تقاضا تھا کہ اپنے دوست کو جانے نہ دینا ہم بس آنے ہی والے ہیں۔ اِنگے کے خط طرح طرح کی پہیلیوں اور معموں سے بھرپور ہوتے تھے اور ساقی فون پر قہقہے لگاتے لگاتے انھیں حل کرتے تھے۔ ایک خط میں لکھا پاپا مجھے امید ہے آپ کے دوست کو جانوروں سے ضرور محبت ہوگی۔ مجھے بچپن کے دن یاد آگئے جب موسیٰ خیل بلوچستان میں تحصیل کے احاطے میں بڑا سا مکان تھا اور مرغیاں ہرطرف کٹ کٹاتی پھرتی تھیں اور ہم کبھی انڈوں کو اٹھاتے، کبھی مرغیوں کو دڑبے میں بند کرتے، کبھی انڈوں کو سواتے اور چوزوں کو اٹھاتے اور کبھی مرغوں کو لڑائی لڑاتے۔ اب ساقی کے گھر میں برسوں کے بعد میری REORIENTATION یوں ہوئی کہ جس کمرے میں بیں داخل ہوا وہاں تو شک پر کئی بھالو، خرگوش اور ونڈر ورلڈ کے کئی عجیب الخلقت جانور ساتھ ساتھ لیٹے ہوئے تھے۔ صوفے کی طرف دیکھا تو سوٹ بوٹ ڈانٹے چھوٹے

بڑے کئی گڈے، شیر، چیتے، بھیڑیئے، ہرن، خرگوش اور جانے کون کون براجمان
تھا۔ دیواروں پر بھی ایسی ہی دنیا آباد تھی۔ ساقی کی رفاقت، بٹیا کے کمرے میں بسیرا
اور بھانت بھانت کے جانوروں کے ساتھ بسر اوقات بس مزہ ہی تو آگیا۔ سوچا ہو نہ ہو
ساقی نے اپنے نیچے کے کتابوں کے کمرے سے دور رکھنے کے لیے یہ سب کچھ کیا
ہوگا۔ چنانچہ اگلی صبح جب میں اس کمرے میں کتابوں کی الماریوں کے پاس نظر آیا تو
ساقی نے کہا یار تمہیں جو کتابیں چاہییں مجھے بتا دو میں سب اوپر لے آؤں گا۔ دیکھتے
نہیں اس کمرے میں بلڈرز کام کر رہے ہیں۔ سامنے کی پوری دیوار نکال دی ہے۔
اب یہ کمرہ آٹھ فٹ چوڑا ہو جائے گا۔ میں نے آگے بڑھ کے دیکھا باغ کی طرف کی
دیوار واقعی نکالی جا چکی تھی، اگلی الماریاں بھی کھسک گئی تھیں۔ نیچے کی طرف کئی فٹ
گہرا غار تھا۔ جس پر لوہے کی پاڑ تنی ہوئی تھی۔ میرا کمرہ عین اس کمرے کے اوپر
تھا۔ اس رات سونے کو تو میں سو گیا لیکن خواب میں کچھ عجیب کیفیت پیدا ہوئی کہ اس
چھت کے نیچے جہاں میں سو رہا ہوں، ایک طرف کی دیوار کھسکتی جا رہی ہے اور پلنگ
نیچے ہوتا جا رہا ہے۔ یا اللہ! یہ چھت نیچے ہی نہ دھنس جائے اور یہ پلنگ، بھالو،
گڈے گڑیا سب اس غار اور لوہے کی پاڑ میں، نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔
ایک دو بجے ہوں گے میں نے روشنی کی اور نیچے گیا جہاں دیوار نکال دی گئی تھی۔
ٹھوک بجا کے اس جگہ کو دیکھا۔ ہمارے ملک میں بلیوں کو رسیوں سے کستے ہیں
یعنی باقاعدہ پاڑ باندھی جاتی ہے، یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ بڑی وحشت ہوئی۔ بلڈرز
نے ساتھ کی دیواروں پر سائبان تان رکھا تھا، ڈرتے ڈرتے اسے ہٹا کر دیکھا۔
لوہے کے ڈنڈے کسے ہوئے تھے۔ بار بار آنکھیں جھپکائیں، ہاتھ لگا کر دیکھا تب
اوپر آیا۔ لندن میں رواج ہے لوگ سوتے جاگتے ریڈیو بجاتے ہیں۔ ریڈیو کے
الارم سے جاگتے ہیں اور ریڈیو کو گلے سے لگا کر سوتے ہیں۔ اس رات کی کھڑکھڑاہٹ
سے ساقی کو خدشہ ہوا کہ شاید مجھے نیند نہیں آتی اور میں کھڑکھڑ کرتا پھرتا ہوں۔
میرے حوالے کرتے ہوئے فرمایا رات کو

خبریں سنا کیجیے، نیند اچھی آتی ہے۔

یوں تو ساقی سب کو خوش رکھتے ہیں لیکن برمنگھم کے حضرات ان کے قابو سے باہر ہو گئے۔ میں نے اپنی عافیت اسی میں دیکھی کہ جس کا فون آتا ساقی کے حوالے کر دیتا۔ ساقی نے سنیچر کو آکسفورڈ اور اتوار کو ڈارٹ فورڈ کا پروگرام طے کر رکھا تھا۔ برمنگھم کے احباب خصوصاً انجمن ترقی اردو کے جے۔ ایس۔ چوہان بھی سنیچر کو نشست رکھنا چاہتے تھے، ان سے اور ان کے احباب سے نمٹنا ساقی کے لیے بلائے جان تھا۔ بھرے جلسے میں جاکر کہہ دیا بھائیو مجھ پر تو نارنگ کی میزبانی کا الزام ناحق عاید ہوتا ہے۔ ان کے میزبان تو برطانیہ میں مقیم دس لاکھ ایشیائی ہیں۔ جے۔ ایس۔ چوہان، لطیف کلیم، سوہن راہی، سب کا اصرار تھا کہ سنیچر کی چھٹی ہوتی ہے اس دن سب کو سہولت ہوگی، لیکن ساقی بھی مجبور تھے۔ یوں بھی بی بی سی ریکارڈنگ کے لیے جمعہ کو برمنگھم جانا طے تھا۔ چنانچہ انجمن ترقی اردو کی نشست اسی شام کی طے پائی۔ ہیوسٹن اسٹیشن سے افتخار عارف اور میں روانہ ہوئے۔ بی بی سی میں کرشنا گولڈ، اشوک رام پال اور مہندر کول سے ملاقات ہوئی۔ چودھویں، پندرھویں منزل پر کیفے تھا جہاں سے سارے برمنگھم کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ بی بی سی ٹیلی ویژن سے ہر اتوار صبح کو ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے لیے "نئی زندگی نیا جیون" نام سے اُردو ہندی کا ملا جلا پروگرام نشر ہوتا ہے جسے کئی پروڈیوسر مل کر تیار کرتے ہیں۔ اس میں کچھ حصّہ خبروں کا ہوتا ہے باقی ثقافتی پروگرام ہوتے ہیں۔ ہم جب اسٹوڈیو میں داخل ہوئے، اگلے ہفتے کے لیے وانی جے رام کے گانوں کی ایڈیٹنگ ہو رہی تھی۔ اس انٹرویو میں وانی جے رام نے جو اب پوری دنیا میں اپنے بھجنوں کے لیے مشہور ہو رہی ہیں، یہ انکشاف کیا کہ فلم پاکیزہ میں انھوں نے فانی کی غزل گائی تھی جسے پاکیزہ کے ریکارڈ پر نہیں لیا گیا تھا۔ وانی نے مہندر کول کی فرمائش پر وہ غزل بھی پیش کی۔ میرا انٹرویو افتخار عارف نے خوش اسلوبی سے لیا۔ شاعر تو وہ ہیں ہی، ٹی۔ وی کے تجربہ کار فنکار بھی ہیں۔ پندرہ بیس منٹ تک ان سے نہایت مزے کی گفتگو رہی جس میں انھوں نے میرے

ادبی موقف کے بارے میں، علمی ادبی کام کے بارے میں، نیز ہندوستان پاکستان میں اردو زبان کی ثقافتی مرکزیت کے بارے میں دلچسپ سوال اٹھائے۔ شام کی گاڑی سے ساقی فاروقی اور اطہر راز بھی برمنگھم پہنچ گئے۔ سوہن راہی اور بیسیوں دوسرے دوست احباب اپنی اپنی موٹروں سے آنے والے تھے۔ چوہان صاحب، کلیم صاحب، انڈوپاک پریم لیگ کے صدر ہربھجن لال ملہی اسٹیشن پر موجود تھے۔ سبز رنگ کی سپر مرسیڈیز میں ہم پروفیسر منیر احمد قریشی کی کوٹھی کی طرف روانہ ہوئے۔ ملہی صاحب کا دفتر اور کارخانہ راستے میں پڑتا تھا۔ تھوڑی دیر اسے دیکھنے کے لیے رکے، معلوم ہوا کہ وہ پانچ بھائی ہیں اور کئی برس پہلے انھوں نے صرف سو پونڈ سے کپڑے کے کارخانہ کا کام شروع کیا تھا۔ باہر نکلے تو کسی نے ملہی صاحب کے چھوٹے بھائی سے کہا کہ خدا آپ کو بھی ایسی ہی مرسیڈیز دے۔ انھوں نے کہا ہم پانچ بھائی ہیں ہم پانچوں ہی کے پاس ایسی ہی مرسیڈیز ہیں، خدا کا شکر ہے۔ پروفیسر منیر احمد قریشی کی کوٹھی برسٹل روڈ پر برمنگھم کے صاف ستھرے علاقے میں ہے، اس کے وسیع باغ میں دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ دیر تک ملنے ملانے اور اکل و شرب کا سلسلہ رہا۔ تقریباً ساڑھے نو بجے نشست شروع ہوئی۔ مشرقی آداب کی رو سے مہمان کی پذیرائی کے لیے جو کچھ کیا جا سکتا ہے جے۔ ایس۔ چوہان انجمن ترقی اردو (ہند) کے برمنگھم کے جنرل سکریٹری نے اس کا حق ادا کیا اور کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ معلوم ہوا بعض حضرات کئی کئی سو میل کا سفر طے کر کے اسکاٹ لینڈ سے، مانچسٹر سے، بریڈ فورڈ سے اور جانے کہاں کہاں سے آئے ہیں۔ خیر مقدمی تقریر کے بعد اردو زبان کے بین الاقوامی رشتوں پر میرا خطبہ ہوا جسے تقریباً پون گھنٹے تک انتہائی توجہ و انہماک سے سنا گیا۔ پھر کافی کا دور ہوا اور اس کے بعد شعر و شاعری کی نشست ہوئی۔ اس میں کئی مقامی شعرا نے کلام سنایا۔ ان میں سخت زمینوں کو پانی کرنے والے لوگ بھی تھے اور ہلکی پھلکی شاعری کرنے والے بھی لیکن اس رات کی دریافت وہ نوجوان تھا جو لپیٹ کے ملا اور کہنے لگا کہ میں ساڑھے تین سو میل کا سفر طے کر کے آیا ہوں۔ کل آپ کو میرے

ساتھ گلاسکو اسکاٹ لینڈ چلنا ہوگا۔ یہ اندرجیت آرزو تھے، لمبا تڑنگا پنجابی نوجوان۔ تھوڑی دیر میں اس نے اپنی غزل سنائی۔ صاف ستھرا لہجہ، پڑھنے کا انداز اچھا، دیارِ فرنگ میں ایسے شخص سے مل کر خوشی ہوئی۔ وہ دیر تک اپنے اشعار سناتا اور محفل کو گرماتا رہا۔ بعد میں سوہن راہی، اطہر راز اور ساقی فاروقی نے بھی سامعین کے اصرار پر کلام سنایا۔ لگ بھگ تین بجے صبح یہ نشست ختم ہوئی۔ بعض لوگوں کو اسی وقت اپنے اپنے شہروں کو روانہ ہونا تھا۔ ملنے ملانے اور بات چیت کرنے میں گھنٹہ بھر اور نکل گیا۔ تقریباً چار بجے ہم سو پائے کیونکہ سات بجے لندن کے لیے روانہ ہونا تھا۔

ویک انڈ پر مردانِ حُر کو کئی ضروری اور غیر ضروری کام کرنے پڑتے ہیں۔ ساقی ایسے کاموں میں لگے رہے مثلاً موٹر دھونا، بلیوں کے لیے دودھ لانا، کچھوے کے لیے کیلے اور سلاد کے پتے، ناشتے کے لیے انڈے ڈبل روٹی وغیرہ وغیرہ۔ میں اس دوران عبداللہ حسین اور محسن شمسی کی تلاش کرتا رہا جن کو تاریخوں کی صحیح اطلاع نہیں تھی اور فون پر نہیں مل پا رہے تھے۔ جب ہم آکسفورڈ کے لیے روانہ ہوئے تو موسم صاف تھا، سڑکیں خالی، راستہ بھر باتیں ہوتی رہیں اور سفر مزے سے کٹا۔ تین بجے ہم آکسفورڈ پہنچ گئے۔ لندن اور لندن کے نواح میں لگ بھگ ہر جگہ اردو کے ادیب و شاعر آباد ہیں۔ ایک حالیہ جائزے کے مطابق برطانیہ میں اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد دس لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ اس وقت اردو بولنے والوں کا اوسط برطانیہ کی کل آبادی کا دو فیصد ہے اور یہ حقیقت ہے کہ برطانیہ میں انگریزی کے بعد اردو ہی رابطے کی دوسری بڑی زبان ہے۔ برطانیہ سے اردو کے دو روز نامے، تین ہفت روزے اور متعدد ماہنامے شائع ہوتے ہیں۔ حال ہی میں یہ دلچسپ بیان شائع ہوا تھا کہ برطانیہ کی عدالت عالیہ نے بریڈ فورڈ میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ برطانوی حکومت نے بریڈ فورڈ کے اردو بولنے والے شہریوں کا یہ مطالبہ منظور نہیں کیا تھا جس پر ان شہریوں نے

برطانیہ کی عدالتِ عالیہ میں مقدمہ دائر کیا اور عدالتِ عالیہ نے شہریوں کے حق میں فیصلہ دیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ پروی کونسل میں اپیل ہو رہی ہے۔ اردو کے فروغ کے لیے کئی علمی اور ادبی انجمنیں کام کر رہی ہیں جن میں اردو مجلس، انجمنِ ترقیِ اُردو ہند، حلقۂ ادب، اکیڈمی آف اردو اسٹڈیز، بزمِ ثقافتِ پاکستان، انجمنِ ترقیِ اُردو برطانیہ، انجمنِ برگِ گل اور اردو فورم بطورِ خاص لائقِ ذکر ہیں۔ لندن یونی ورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز کا بھی اردو کے فروغ میں بڑا ہاتھ ہے۔ لیکن ان سب کے علاوہ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ خود حکومتِ برطانیہ بھی اردو کی ترویج کا ایک خاص ذریعہ ہے یعنی برطانیہ میں آنے والے اُن ہندوستانی اور پاکستانی افراد کی سہولتوں کے لیے جو انگریزی نہیں جانتے، حکومت ایسے سرکاری اہلکاروں کا تقرر کرتی ہے جو اردو میں استعداد رکھتے ہوں، نیز ایسے باشندوں کے لیے مختلف سرکاری ادارے وقتاً فوقتاً اپنے قواعد وضوابط، اشتہارات و اطلاعات اردو میں ترجمہ کر کے شائع کرتے ہیں۔ سرکاری افسروں کے لیے " ہولبرن کالج آف لا اینڈ لنگویج " میں باقاعدہ اردو درس و تدریس کا انتظام ہے۔ کئی دوسرے پرائیویٹ اداروں کے ذریعے بھی اردو تعلیم کی سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں۔ بی بی سی ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے اردو کے باقاعدہ پروگرام نشر ہوتے ہیں، اور یہ روزانہ اور ہفتہ وار پروگرام برطانیہ میں اردو بولنے والوں کی زندگی کا لازمی عنصر ہیں۔ بعض شہروں کے مقامی ریڈیو بھی وقتاً فوقتاً اردو پروگرام نشر کرتے ہیں۔ ان پروگراموں میں خبروں کے علاوہ اردو ڈرامے اور نغمات بھی پیش کیے جاتے ہیں اور مشاعروں اور تقاریب کا اہتمام بھی ہوتا ہے۔ لندن کے بعد برمنگھم، مانچسٹر، بریڈ فورڈ اردو کے خاص علاقے ہیں، اور یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے بعد دنیا بھر میں برطانیہ اور بالخصوص لندن اردو کا سب سے بڑا مرکز بنتا جا رہا ہے۔ اس گفتگو میں سفر مزے سے کٹ گیا۔ آکسفورڈ میں اکبر حیدر آبادی نے پُرتکلف دعوت کا اہتمام کیا تھا اور کئی احباب کو بلایا تھا۔ دہلی میں ان سے پچھلے سال ان کے دیوان

"نمو کی آگ" کی تقریب میں ملاقات ہوئی تھی۔ ان کی اطالوی بیوی لینا، بیٹی ریحانہ اور بیٹا نجف مہمانوں کی خاطر داری میں لگے ہوئے تھے۔ یاور عباس اور ان کی رفیقۂ حیات حمیدہ بیگم سے ملاقات ہوئی۔ حبیب حیدرآبادی، بیگم صدیقہ شبنم، ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب اور سب سے بڑھ کر علی باقر اور نجمہ باقر سے بھی ملاقات ہوئی۔ نجمہ سجاد ظہیر کی بیٹی ہیں اور جواہر لال نہرو یونی ورسٹی میں سائنس کی ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ نجمہ اور علی باقر اپنے علمی کام کے سلسلے میں لندن آئے ہوئے تھے۔ ان سب لوگوں سے مل کر طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ دیر تک باتیں چیتیں رہیں اور شعر و سخن کا دور رہا۔ لیکن اس نشست کا حاصل خسرو کی وہ غزلیں تھیں جو حمیدہ بیگم نے ہارمونیم پر گائیں۔ جب انھوں نے خسرو کی یہ غزل چھیڑی تو سماں بندھ گیا:

نمی دانم چہ منزل بود شب جاے کہ من بودم
بہر سو رقصِ بسمل بود شب جاے کہ من بودم
پری پیکر نگارے سرو قدے لالہ رخسارے
سراپا آفتِ دل بود شب جاے کہ من بودم

یہ شعر سینکڑوں بار کے سنے ہوئے تھے لیکن اب کی کیفیت ہی اور تھی۔ ہر ہر شعر لوگوں نے بار بار سنا اور وجد کی سی کیفیت طاری تھی:

رقیباں گوش بر آواز، او در ناز من ترساں
سخن گفتن چہ مشکل بود شب جاے کہ من بودم
خدا خود میرِ مجلس بود اندر لامکاں خسرو
محمدؐ شمعِ محفل بود شب جاے کہ من بودم

اس کے بعد جب انھوں نے خسرو کی ایک اور شاہکار غزل پیش کی تو پوری محفل ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچ گئی:

بخوبی ہمچو مہِ تابندہ باشی — بملکِ دلبری پائندہ باشی
منِ درویش را کشتی بغمزہ — کرم کردی الٰہی زندہ باشی

جفا کم کن کہ فردا روزِ محشر | بروے عاشقاں شرمندہ باشی
زقیدِ دو جہاں آزاد گشتم | اگر تو ہمنشینِ بندہ باشی
جہاں سوزی اگر در غمزہ آئی | شکر ریزی اگر در خندہ باشی

برندی و بشوخی ہمچو خسرو
ہزاراں خانماں برکندہ باشی

ان اشعار سے اس اجنبی ماحول میں عجیب و غریب کیفیت پیدا ہوئی، اور مجھ درویش راہ گیر پر جو بیت گئی بیان سے باہر ہے۔

رات کو گھر پہنچے تو کئی خط اور پیغام ملے۔ جی چاہا کہ لندن کچھ دن اور رک سکوں۔ لیکن وقت کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ ساقی نے کہا یار دنیا بھر سے ملنا ملانا ہو رہا ہے، ٹھہرے آپ میرے پاس ہیں لیکن میری تو آپ سے ملاقات ہی نہیں ہو پا رہی ہے۔ میں صوفے میں دھنسا کارڈورائے کی سلوٹوں سے ساقی کی بلّیوں کے بال نکال رہا تھا، کہنے لگے یار یہ ہندوستانی پاکستانی عجیب چیز ہوتے ہیں، کیسا کیسا دوست میرے گھر آتا ہے لیکن جانوروں سے کوئی محبّت نہیں کرتا اور تو اور بلّیوں سے بھی بدکتے ہیں۔ میں نے کہا یار سنو مجھے یوں لگتا ہے تمھاری بلّی مجھ سے مانوس ہوگئی ہے۔ آج جب میں مکان میں اکیلا تھا اور دروازے کے پاس کھڑا فون سن رہا تھا کہ مُنسی آئی اور قریب کھڑی ہوگئی۔ میں نے دو ایک بار پچکارا، پیٹھ سہلائی، پھر میں فون پر باتوں میں لگ گیا۔ مجھے لگا پیروں میں کوئی چیز گدُبدا رہی ہے دیکھا تو مُنسی موڈ میں ہے۔ کچھ دیر تو میں حیران رہا پھر سوچا ہو نہ ہو یہ دروازے سے باہر جانا چاہتی ہوگی۔ میں نے دروازہ کھول دیا، مُنسی باہر تشریف لے گئیں۔ اب ہر دو تین منٹ کے وقفے سے یہ عمل دہرایا جانے لگا۔ یعنی پاس آ کے کھڑی ہو جاتی، پیٹھ کھجاتی، میں دروازہ کھولتا، وہ نکل جاتی، پھر ایک منٹ کے بعد آموجود۔ آخر میں نے فون بند کر دیا اور دروازہ سے ہٹ گیا۔ لگتا ہے موصوفہ کو اظہارِ عشق میں قدرتِ تامّہ حاصل ہے۔ ساقی دیر تک ہنستے رہے کہ چلیے ہمارے ایک دوست سے تو کچھ ربط ضبط پیدا ہوا۔

اس خوشی میں انھوں نے برانڈی کی بوتل نکالی اور بسکوے کی بوندوں میں ہم باتوں میں لگ گئے۔ دوستوں کا ذکر نکلا تو ہر بات بے لاگ بے باک کہہ ڈالی، کہیں تعریف، کہیں طنز، کہیں گالی، سالے بدمعاش اسی لکیر کو پیٹتے جاتے ہیں، وہی قافیہ وہی ردیف، وہی فرسودہ رومانی شاعری، ارے کم بختو کچھ توڑو، کچھ بغاوت کرو، کچھ نئی راہ نکالو، کچھ نئی آوازیں، کچھ نئے لفظ، کچھ نئی باتیں، سالے سب اسی معشوق کی لکیر کو پیٹتے جارہے ہیں۔ بھئی نارنگ آدمی تو ایک ہی تھا، ن م راشد، آہاہا، کیا زندہ آدمی تھا۔ آخری وقت تک اسے میں نے نئے نئے تجربے کرتے دیکھا۔ نئے لوگوں سے ملتے، نئی کتابیں پڑھتے، نئے خیالات، نئی باتیں، جو سوچے گا نہیں وہ تخلیق کیا کرے گا۔ تخلیق میں نیاپن نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ فکر و خیال کا نیاپن، موضوع و معنی کا نیاپن، الفاظ و اظہار کا نیاپن۔ ذرا ڈلن تھامس کی یہ لائنز دیکھو

THE FORCE/THAT THROUGH THE GREEN FUSE
DRIVES THE FLOWER, DRIVES MY GREEN AGE

کیا بات کہی ہے کیا معنی لفظوں میں سمو دیے ہیں، کیسی قوت ہے اس اظہار میں

THAT THROUGH THE GREEN FUSE DRIVES THE FLOWER

ساقی نے بتایا کہ وہ جلد اپنا تیسرا مجموعہ " رازوں سے بھرا بستہ " شائع کر رہے ہیں۔ ساقی جب مزے میں ہوتے ہیں تو اپنے پسندیدہ انگریزی شاعروں کے مصرعے سناتے ہیں۔ الیٹ کا یہ مصرع بھی انھوں نے بار بار سنایا :

I MEASURED MY LIFE WITH COFFEE SPOONS

لیکن عاشق وہ آڈن کے اس مصرع پر تھے، بار بار پڑھتے تھے اور جھومتے تھے :

THE ENEMY HAS CHANGED ITS ADDRESSES

آہاہا کتنا صحیح ہے ہمارے عہد کے لیے۔ کچھ معلوم نہیں تیر کہاں سے آئے گا، ہر وقت ہر شے گھات میں ہے۔ تھوڑی دیر میں دہلی، علی گڑھ، احمد آباد، بمبئی کا ذکر چل نکلا

آل احمد سرور، قرۃ العین حیدر، شہریار، شمس الرحمٰن فاروقی، محمود ہاشمی، قاضی سلیم، بلراج کومل، صلاح الدین پرویز، مجتبیٰ حسین، باقر مہدی، محمد علوی، وارث علوی، بلراج مینرا اور جانے کس کس کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ یوں ان کا اور بہت سے دوسرے ہم عصروں کا ذکر نئے تخلیقی رویوں کے ضمن میں جلسوں اور محفلوں میں میری تقریروں کے دوران ہوتا رہا تھا۔ ساقی ان میں سے زیادہ تر سے ذاتی طور پر واقف تھے۔ صلاح الدین پرویز سے ساقی اور افتخار کی ملاقات لندن میں ہو چکی تھی۔ ان کا نیا ناول نمرتا بھی ان تک پہنچ چکا تھا، لیکن صلاح الدین پرویز کی شاعری سے پوری واقفیت نہیں تھی۔ میں نے بتایا جس نئے پن پر تم زور دیتے ہو اور جو ادب کی جان ہے صلاح الدین پرویز کے ہاں منفرد تخلیقی شان کے ساتھ ابھرا ہے۔ اس کے کندھوں نے فرسودہ روایات کا بوجھ قبول ہی نہیں کیا۔ اس کے لہجہ میں ایسی تازگی، ایسا رس اور ذائقہ ہے جو یکسر اس کا اپنا ہے۔ اس کی کوئی نظیر جدید شاعری میں کہیں اور نہیں ملتی۔ کیا یہ اردو کے عوامی رشتوں کی یا پراکرتی احساس کی بازیافت ہے، شاید ہاں، لیکن بالکل غیر شعوری اور فطری بس میٹھے ٹھنڈے پانی کا جھرنا ہے جو بہہ رہا ہے، اور کیا تخلیقیت کی یہ جہت تعجب خیز نہیں کہ اس میں جہاں قدیم ہندوستانی روح کی گونج ہے وہاں اسلامی اقدار کے سرچشموں کا فیضان بھی ہے۔ نمرتا میں تو شاعری ناول بن گئی ہے اور ناول شاعری ہو گیا ہے۔ عورت اور مرد کے ازلی ابدی رشتوں اور تخلیق کے دکھوں اور خوشیوں کو کس فنی کمال سے پیش کیا ہے، کیا اس میں آریاؤں، بودھوں، گپتاؤں، بھگتوں کی انسانی تہذیب کی صدیوں کی گونج سنائی نہیں دیتی۔ ہم دونوں کے گلاس خالی تھے۔ ساقی نے تھوڑی سی برانڈی ڈالی اور ہاتھ بڑھا کر اوراق اور فنون کے تازہ شمارے اپنے سامنے رکھ لیے۔ ساقی وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی دونوں کا احترام کرتے ہیں، ارادت کس سے ہے یہ ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ کچھ مدت پہلے ساقی نے سلیم احمد کے مجموعۂ کلام پر مقدمہ لکھا۔ چھپن نظموں میں سے صرف سولہ کو پسند کیا

باقی ٹاٹ باہر۔ مجموعہ چھپا تو کلام موجود مقدمہ ناموجود۔ ساقی برہم۔ اس موقع پر انھوں نے سلیم احمد کو جو خط لکھا تھا فنون سے اس کا ایک ایک لفظ پڑھ کر سناتے رہے اور دیر تک پاکستان میں اردو شاعری کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ سلیم احمد والا مقدمہ اوراق میں شائع ہوچکا تھا اور میں اسے دیکھ چکا تھا۔ ابھی باتیں ہو رہی تھیں کہ ساقی نے کہا یار معلوم ہے، وقت کیا ہوگیا ہے؟ پونے دو بج رہے تھے۔ میں نے کہا کل اتوار ہے تم اپنا دیکھ لو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کہنے لگے اردو میں بھی کیسا کیسا ذی فہم بستا ہے۔ یہ سلطان حیدر جوش بھی کیا خوب چیز تھا ـــ لکھتا ہے کہ عورت اور مرد پیچھے سے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ تم نے وہ نوٹ پڑھا تھا میرا جو شب خون میں چھپا تھا۔ میں نے کہا مزے کا تھا مگر تمھارے یہاں تو لوگوں نے اس پر اعتراض کیا ہوگا۔ ساقی نے ایک ایک لفظ اپنے لہجے میں پڑھ کر سنایا تو کچھ اور ہی لطف آیا۔ کہنے لگے بیدی فطرت کے کیسے کیسے رازوں سے واقف ہیں، عورت کے حسنِ ثلاثہ کا تذکرہ "ایک چادر میلی سی" میں کیا خوب ہے لیکن حسنِ چہار گانہ بھی تو کوئی چیز ہے۔ بیچارہ ... !

پو پھٹنے والی تھی جب میں نے ساقی سے تازہ نظموں کی فرمائش کی۔ ساقی جلسوں محفلوں میں کلام نہیں سناتے۔ یہ بات راشد میں بھی تھی۔ وہ بھی خاص خاص احباب کو کلام سنانا پسند کرتے تھے۔ لندن کے ادبی حلقوں میں ساقی کا خاصا احترام ہے۔ راشد کے بعد اب ان کا سینئر شاعر سمجھا جانا برحق ہے۔ میرے کہنے پر انھوں نے اپنی دو تازہ نظمیں "ڈسٹ بن" اور "رات کے راج ہنس" سنائیں۔ "ڈسٹ بن" کا معاملہ یہ ہے کہ جب تک کسی احساس یا خیال کو لاشعور سے نکال کر شعور میں پرکھا نہیں جاتا وہ لاشعور میں انڈے بچے دیتا رہتا ہے اور اس سے رہائی ناممکن ہے۔ "رات کے راج ہنس" ایک فنکار کے اندر کی وہ ازلی آواز ہے جسے ضمیر کہتے ہیں اور جو ہر اس فنکار کو جھنجھوڑتا رہتا ہے جو سمجھوتوں کی سطح پر زندہ رہتا ہے اور کڑھتا سلگتا رہتا ہے۔ دیر تک

ان نظموں کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ آسمان پر ہلکی ہلکی روشنی پھیل رہی تھی۔ یہ رات اپنی رات تھی، یہ صبح اپنی صبح تھی۔

اگلے دن مجھے اپنے ایک لیکچر کے لیے کچھ کتابوں کی ضرورت تھی۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ساقی کی الماریوں میں ہندوستان اور پاکستان کے تقریباً سبھی قابلِ ذکر شاعروں کے مجموعے موجود تھے۔ ساقی کے گھر اور کچن سے میری واقفیت خاصی بڑھ چکی تھی۔ وہ کہیں جانے والے تھے تو میں نے انھیں اطمینان دلاتے ہوئے کہا کہ آپ میرے ناشتے کی فکر نہ کیجیے ناشتہ میں تیار کر لوں گا۔ یوں چاہیے بھی کیا تھا دو سلائس تھوڑا سا جوس اور چائے کی پیالی۔ جب بھوک لگی تو سب سے پہلے مجھے جوس کا خیال آیا، جوس عموماً گتے کے ہلکے پھلکے ڈبوں میں آتا ہے۔ ریفریجریٹر کھول کر دیکھا، دو ایک بوتلیں دکھائی دیں مگر خالی۔ گتے کے ڈبوں کی ایک لمبی قطار دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ سوچا ہفتہ شروع ہوا ہے، ساقی بہت سا جوس ایک ساتھ لے آئے ہوں گے۔ قریب جاکر دیکھا تو معلوم ہوا بلیوں کی خوراک ہے۔ ساقی ہر روز صبح مجھے نہایت فیاضی سے آدھا ابلا انڈا بنا کر دیتے تھے۔ میں لاکھ منع کروں کہ بھئی تکلیف کیوں کرتے ہو تو بھی انڈا مجھے ضرور ملتا۔ کہتے تھے یار تم بھی کیا یاد کرو گے کس رئیس سے پالا پڑا تھا۔ دعوت تو تمھاری ہر روز باہر ہوتی ہے، میرے حصے کا تو یہی ناشتہ ہے۔ اور تو کچھ کر نہیں سکتا انڈا تو کھلا سکتا ہوں۔ مجھے آدھا ابلا انڈا بنانا ہی آتا ہے سو اسے تم ضرور کھا لیا کرو۔ سو میں خاموشی سے انڈا قبول کر لیتا۔ اب مجھے سلائس کی تلاش ہوئی ریفریجریٹر میں، نیپکن والی ٹوکری میں، ادھر ادھر ہر جگہ دیکھا، نہ ملی، میز پر ایک سرخ رومال میں کالی روٹی کے کچھ ٹکڑے لپٹے ہوئے تھے۔ کالی نہیں جیٹ بلیک۔ ساقی اس کالی روٹی کی کئی بار تعریف کر چکے تھے لیکن خدا جانے کیا بات تھی خود اسے نہیں کھاتے تھے اور چند ٹکڑے جوں کے توں لپیٹ کے رکھے تھے۔ بھوک نے زور مارا تو میں نے ایک ٹکڑا اٹھا لیا، لگا کوئلے چبا رہا ہوں۔ پھر ڈھنڈیا شروع ہوئی

تو ایک جگہ لکڑی کا چوہے دان سا پڑا نظر آیا۔ سوچا اس کی کرامات بھی دیکھی جائے۔ ڈھکنا کھولا تو ڈبل روٹی اس میں تشریف رکھتی تھیں۔ میں خدا کا شکر بجالایا لیکن اب ٹوسٹر کی ضرورت پیش آئی۔ اس دن معلوم ہوا کہ دوسرے کے گھر میں ہاتھی ڈھونڈنے والی مثال کچھ ایسی غلط نہیں تھی۔ لیکن ٹوسٹر ہو تو ملے۔ تعجب یوں ہوا کہ ساقی روٹی روز سینک کر پلیٹ میں رکھتے تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ موصوف اسے گیس کے تنور پر تاپتے تھے۔ چائے کے لیے دودھ کی تلاش کا نتیجہ بھی کچھ ایسا ہی نکلا۔ مُنّسی میکسی اور میں ناشتہ ایک ہی جگہ کرتے تھے اور ان کے دودھ کے برتن ہمیشہ بھرے بھرے رہتے تھے۔ جب میں نے ایک ایک کرکے دودھ کی سب بوتلیں دیکھ ڈالیں اور کسی میں دو بوندیں کسی میں چار بوندیں نظر آئیں تو احساس ہوا کہ خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا، دودھ سب بلیوں کے تصرف میں آچکا تھا۔ کالی روٹی کے ساتھ کالی چائے کا بھی اپنا مزہ تھا BLACK IS BEAUTIFUL شاید اسی کو کہتے ہیں۔

اتوار کی صبح ہمیں ڈارٹ فورڈ جانا تھا۔ ساقی نے اس دن گھر ٹھیک کیا، کچھوے کو سلاد کھلایا اور رات چونکہ عزیز حامد مدنی کے اشعار بھی سنائے تھے اس لیے خوب موڈ میں تھے۔ موسم اچھا تھا ہی۔ باہر نکلے تو پڑوسن چھوٹے فوارے سے گلاب کی کیاری میں پانی دے رہی تھی۔ علیک سلیک ہوئی ساقی نے خیریت پوچھی اس نے بھی خیریت پوچھی۔ ساقی نے کہا خدا کا شکر ہے بیوی میکے گئی ہوئی ہیں میں بالکل اکیلا ہوں تمھارا جب جی چاہے آجاؤ بس یہ سڑک بیچ میں ہے۔ وہ کچھ مسکرائی کچھ شرمائی گلابوں کو پانی دینے لگی۔ میں نے کہا ساقی یار کیا بدتمیزی ہے۔ کہنے لگے میں تو فرموداتِ ربانی پر عمل کررہا ہوں۔ جانتے ہو انجیلِ مقدس میں کیا لکھا ہے: LOVE THY NEIGHBOUR

ڈارٹ فورڈ کا سفر ڈیڑھ گھنٹے کا تھا۔ حبیب حیدرآبادی سے ان کی کتاب "انگلستان میں اردو" کے ذریعے تعارف ہوچکا تھا۔ انھوں نے

ٹوٹنہم میں اُردو کا کتب خانہ قائم کیا ہے اور "اکیڈمی آف اردو اسٹڈیز"
کے ذریعے اردو درس و تدریس کا اہتمام بھی کیا ہے۔ ان کا بیٹا رافع حبیب دہلی میں مل چکا
تھا۔ رافع راشد اور الیٹ کے حوالے سے شاعری میں جدیدیت کے رجحان پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ
لکھ رہا ہے۔ بیگم صدیقہ حبیب بھی شاعری کا پاکیزہ مذاق رکھتی ہیں۔ THE ARDENT PILGRIM
کے مشہور مصنف اقبال سنگھ سے پہلی بار یہیں ملاقات ہوئی۔ میں نے
ملتے ہی کہا کہ حضرت آپ لندن میں ہیں اور پچھلے پانچ سات برسوں میں
بیسیوں بار اقبال صدی کے سلسلے میں آپ کی ڈھنڈیا ہوئی آپ ہاتھ نہیں
آئے۔ اقبال سنگھ مزے کے آدمی ہیں، کم گو، قناعت پسند، گوشہ گیر، لندن میں صحافی کی
زندگی بسر کرتے ہیں، محفلوں اور جلسوں میں بہت کم جاتے ہیں۔ میری آمد کا سن کر
وہ ڈاکٹر فاخر حسین کے ساتھ ملنے آگئے تھے۔ اقبال سنگھ کے والد اقبال کے گہرے دوست
تھے، اتنے گہرے دوست کہ ان ہی کے نام پر اپنے بیٹے کا نام اقبال سنگھ رکھا۔
ڈاکٹر فاخر حسین یونسکو سے وابستہ ہیں، پیرس میں پڑھاتے ہیں اور لندن میں بھی۔
حال ہی میں انھوں نے گذشتہ لکھنؤ کا ترجمہ یونسکو کے لیے کیا ہے جو شائع ہو چکا
ہے۔ حبیب صاحب کے یہاں شعر و شاعری کا دور بھی ہوا۔ افتخار عارف سے ملاقات
تو کئی بار ہو چکی تھی لیکن ان کی زبانی ان کا کلام سننے کا موقع آج ملا۔ ان کی تازہ گوئی
اور خوش فکری سے دل خوش ہوا۔ کچھ شعر یاد رہ گئے:

عذابِ وحشتِ جاں کا صلہ نہ مانگے کوئی
نئے سفر کے لیے راستہ نہ مانگے کوئی
بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں
عجیب رسم چلی ہے دعا نہ مانگے کوئی

عذاب یہ بھی کسی اور پر نہیں آیا
کہ ایک عمر چلے اور گھر نہیں آیا

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے

یہ قرضِ کج کلہی کب تلک ادا ہوگا
تباہ ہو تو گئے ہیں اب اور کیا ہوگا
غبارِ کوچۂ وعدہ بکھرتا جاتا ہے
اب آگے اپنے بکھرنے کا سلسلہ ہوگا
صدا لگائی تو پرسانِ حال کوئی نہ تھا
گماں یہ تھا کہ ہر اک شخص ہم نوا ہوگا
ہزار طرح کے ڈر ہیں مگر یقین بھی ہے
وہ اب کے آیا تو پہلے سے باوفا ہوگا
ابھی تو دھند میں لپٹے ہوئے ہیں سب منظر
تم آؤ گے تو یہ موسم بدل چکا ہوگا

غرض لطف و نشاط کی یہ محفل شام ڈھلے تک جمی رہی۔ چلتے چلتے ایک عجیب بات ہوئی۔ بیگم صدیقہ حبیب نے، جو معنی تبسم کی بہن ہیں، کہا میں آپ کے دوست کی بہن ہوں تو آپ کی بھی بہن ہوئی آج رکھشا بندھن ہے لائیے میں آپ کے راکھی باندھ دوں۔ میں نے ہاتھ بڑھا دیا۔ گھر سے ہزاروں میل دور اپنائیت کے اس اچانک اظہار سے میری آنکھیں بھیگ گئیں۔

اس سفر میں مشتاق احمد یوسفی کا بھی ساتھ رہا۔ کچھ باتیں بھی ہوئیں، لیکن نہیں ہوئیں۔ ملاقات ہوئی بھی لیکن نہیں ہوئی۔ ان سے جس طرح ملنا چاہیے تھا ملنے کی حسرت رہی۔ سب آرزوئیں کس کی پوری ہوتی ہیں۔ کچھ حساب ایسے بھی ہوتے ہیں جو چکائے نہیں جا سکتے۔

اب ناروے جانے کے دن قریب آرہے تھے۔ وہاں اخبارات کو جو

مضمون دینے تھے، ان میں سے ایک ابھی تیار نہیں تھا۔ اور ایک نیا لیکچر بھی لکھنا تھا۔ اگلی شام ایک یادگار شام تھی۔ وہ شام ساقی نے اپنے لیے محفوظ رکھی۔ ساقی کی دوست ہیلگا جو جرمن زبان پڑھاتی ہیں شام کو آگئیں۔ کھانا ہم نے مل کر کھایا اور GOLDERS GREEN سے آگے HAMSTEAD کی سیر کو نکل گئے۔ چاندنی رات تھی، سارا علاقہ نہایت پر اسرار اور خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ ساقی نے بتایا یہ علاقہ انتہائی تاریخی اہمیت کا حامل ہے صدیوں سے یہ شاہی خاندان کی ملکیت چلا آتا ہے۔ اس کا کوئی حصّہ فروخت نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں سب سے پہلے ہم نے کیٹس کی رہائش گاہ دیکھی جسے اب میوزیم اور لائبریری میں بدل دیا گیا ہے۔ سامنے چھوٹا سا خوشنما پارک ہے، اور میوزیم سے لگے ہوئے کمروں میں ہر ہفتے شاعری کی نشستیں ہوتی ہیں۔ بعد میں وہ عمارت دیکھی جس میں رابندرناتھ ٹیگور آکر مقیم ہوئے تھے۔ اس پر باقاعدہ کتبہ لگا ہوا تھا۔ اگلی گلی کے نکڑ پر وہ مکان تھا جہاں ڈی ایچ لارنس نے اپنی عمرِ عزیز کے کچھ سال صرف کیے تھے۔ نچلی منزل پر کھڑکیاں اور دروازے کھلے تھے۔ کتبہ یہاں بھی لگا تھا لیکن شاید یہ پوری عمارت زیرِ مرمت تھی۔ دیر تک اس علاقے میں گھومتے رہنے کے بعد ہم ایک پب میں پہنچے۔ ساقی نے بتایا کہ وہ اکثر شامیں یہاں بسر کرتے ہیں۔ اور نوجوان ادیبوں اور شاعروں سے اکثر یہاں ملاقات ہو جاتی ہے۔ یہاں رات کے ایک دو بجے تک رونق تھی، کیفے اور ریستوران اور طرح طرح کی دکانیں کھلی تھیں۔

اگلی رات مزے کی بات ہوئی۔ جس کمرے میں میں تھا بلڈرز وہاں تک پہنچ گئے تھے اور انھوں نے اس کمرے کی الماریاں ڈھادی تھیں کیونکہ دروازے کھڑکیاں، الماریاں، ساقی کے گھر کی ہر پرانی چیز نئی ہو رہی تھی۔ میں بتی بجھا کر سو گیا۔ تھوڑی دیر میں محسوس ہوا کوئی نرم نرم چیز کمبل کے نیچے سرسرا رہی ہے۔ جاڑا کڑاکے کا ہو تو شاید بلّی کے ساتھ نبھ جائے لیکن کچھ ایسی سردی بھی

نہیں تھی۔ میں نے سونے کی کوشش کی لیکن بلّی ذہن سے نہیں نکلی۔ یہ بھی خیال تھا کہ ساقی کو باور کراچکا ہوں کہ مجھے ان کے جانوروں سے محبت ہے تاکہ وہ گنڈی اور انگے بنی کو بتا سکیں کہ آخر میرا ایک دوست تو ایسا ہے جو جانوروں سے نفرت نہیں کرتا، بہت کوشش کی کہ سو رہوں۔ لیکن جب کوئی صورت اپنی جانور پرستی کا بھرم رکھنے کی نظر نہ آئی تو تین ساڑھے تین بجے میں آہستہ سے اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ دوسرے کمرے میں ساقی اپنا پاجامہ سر کے نیچے رکھے بے سدھ سو رہے تھے۔ میں نے کہا حضرت آدھی رات تو میں نے بلّی کے ساتھ گزار دی، اب کچھ آپ بھی تو ... ساقی ہڑبڑا کے اٹھے، اوہو ... کمال ہوگیا یار، یہ سالی وہاں کیسے پہنچ گئی ... ؟

لندن کے دوران قیام ایک ایسی خبر بھی سنی جس سے خوشی بھی ہوئی اور فخر بھی، اور جس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کا تجسس پیدا ہوا۔ معلوم ہوا کہ مونوٹائپ کمپنی نے اردو نستعلیق کتابت کو نوری نستعلیق کے نام سے کمپیوٹر میں ڈھال لیا ہے۔ اس میں پاکستان کے دو ماہرین احمد مرزا جمیل اور مطلوب الحسن سید کی کوششوں کو خاصا دخل تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ یکم اکتوبر سے جنگ لاہور اسی برقیاتی کتابت سے شائع ہونا شروع ہوگا۔ یہ واقعہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے زمانے سے آج تک نستعلیق کو مشینی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی جتنی بھی کوششیں کی گئی تھیں، ان میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ صدیوں پہلے کوفی اور نسخ کی بنیادوں پر اسلامی خطاطوں اور مصوروں کی تاریخی کوششوں سے جو چھ بنیادی خط "شش قلم" کے نام سے وجود میں آئے تھے، یعنی نسخی، ثلث، محقق، ریحانی، رقاع اور توقیع، اور بعد میں دو مزید بنیادی خط یعنی تعلیق اور نستعلیق ایران اور برصغیر ہند میں بالترتیب فارسی اور اردو زبانوں کے لیے گویا قومی خط کا درجہ اختیار کر گئے، لیکن صنعتی دور کی تکنیکی ضرورتوں نے نستعلیق کو ایسا دھکا پہنچایا کہ نہ صرف عالمِ اسلامیہ بلکہ ایران میں بھی نستعلیق کا چلن روز بروز

کم ہونے لگا، اور نسخ ٹائپ کا رواج عام ہونے لگا۔ یہ گویا ایک مہتم بالشان روایت سے دست برداری کا اعلان تھا۔ پاکستان میں بھی پچھلے کئی برسوں سے اس روش پر عمل پیرا ہونے کی کوششیں شروع ہوگئی تھیں، اور ابتدائی درسی کتابیں بھی نسخ میں لکھی جانے لگی تھیں۔ لیکن سب سے بڑا چیلنج ماس میڈیا کی ضرورتوں یعنی اخباروں اور عام کتابوں کی طرف سے تھا جنھیں عوام صدیوں سے نستعلیق میں پڑھنے کے عادی ہوچکے تھے۔ احمد مرزا جمیل اور مطلوب الحسن سید نے کوشش یہ کی کہ کسی طرح نستعلیق کو برقیاتی ضرورتوں کے مطابق ڈھال دیں تو اس کا مستقبل محفوظ ہوجائے اور ہمیشہ کے لیے اس کے چلن کی ضمانت بھی فراہم ہوجائے۔ یہ کارنامہ معمولی نہیں ہے کہ ان کی مساعی سے اردو برقیاتی طباعت کے تقاضے پورے کرنے کے لائق ہوگئی ہے اور اس طرح دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے شانہ بہ شانہ کھڑی ہوسکتی ہے۔ طباعت کے اس برقیاتی طریقۂ کار میں حروف کے الگ الگ جوڑ نہیں بٹھائے جاتے بلکہ پورے پورے لفظوں کا عکس سوراخ دار کاغذ پر کمپیوٹر کے ذریعے چھیدا جاتا ہے اور پھر پوری کی پوری عبارت فلم پر اتر آتی ہے۔ فلم سے اخبار یا کتاب چھاپنے کا باقی طریقہ وہی ہے جو آفسیٹ میں ہے۔ پورے لفظوں کے عکس سے مراد یہ نہیں کہ اردو کا پورا لغت کمپیوٹر کے ذہن نشین کرایا گیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ حرف اور لفظ کے بیچ کی راہ اختیار کی گئی ہے جو طباعتی کفایت پر بھی مبنی ہے اور تکمیل کا پہلو بھی رکھتی ہے یعنی حرفوں کے وہ تمام جوڑ کمپیوٹر کے برقیاتی ذہن میں بٹھائے گئے ہیں جن کے ملانے سے اردو کے تمام الفاظ متشکل ہوتے ہیں۔ ان جوڑوں کی تعداد بھی تیس ہزار سے زائد پہنچتی ہے یعنی اردو کی کل لغات کا تقریباً نصف حصہ کتابت کرکے کمپیوٹر کو ہضم کرادیا گیا ہے۔ ٹائپسٹ کی بورڈ پر حروف کو ٹائپ کرتا جاتا ہے اور جیسے کوئی لفظ ٹائپ ہوچکتا ہے کمپیوٹر کا برقیاتی ذہن حروف کی مناسب شکلوں کو خود بخود جوڑ کے لفظ کو مکمل شکل دے دیتا ہے۔ گویا حرف بہ حرف کمپوزنگ کا پچھلا تصور از کار رفتہ ہوگیا۔ اب کثیرالاستعمال جوڑوں کی مدد سے پورے لفظ اور

پوری عبارت از خود ڈھلتی ہے جس سے کام کی رفتار کئی گنا زیادہ تیز ہو جاتی ہے ۔
کی بورڈ کے ذریعے تصحیح بھی بنائی جا سکتی ہے یعنی کوئی لفظ یا سطر سیکنڈوں کے اندر
اندر تبدیل کی جا سکتی ہے، اور یہ سارا کام برقیاتی ذہن کے ذریعے ہوتا ہے کوئی عبارت
کہیں لکھی یا ٹائپ نہیں کی جاتی ۔ اردو کے کثیرالاستعمال جوڑوں کی دریافت اور پھر
تکنیکی مہارتِ تامّہ سے انھیں برقیاتی کمپیوٹر کے ذہن نشین کرنا ایسا کارنامہ ہے جس
کے اثرات نہایت دور رس ہوں گے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ "لیزر کامپ" مشین
سے کمپوزنگ چھوٹے بڑے کئی پوائنٹ میں ہو سکتی ہے اور انگریزی عبارت اگر
اردو متن کے بیچ میں آجائے تو رومن میں ڈھالی جا سکتی ہے ۔ اس تاریخی دریافت
سے ایک طرف تو نستعلیق کی خوبصورت روش، اس کے دائروں اور کششوں کا
تحفظ ہو گیا، دوسرے کاتب پر کلی انحصار بھی ختم ہو گیا ۔ اردو اخبارات، رسائل اور
تجارتی سطح پر طباعت و اشاعت کے مستقبل پر اس کا کتنا زبردست اثر پڑے گا،
اور اردو زبان کے فروغ میں اس سے کیسی بنیادی مدد ملے گی، اردو والوں کے
لیے یہ لمحۂ فکریہ ہے ۔

منزل منزل عشق وجنوں

سکنڈے نیویا اوسلو ناروے

لندن ہیتھرو سے اوسلو ناروے کا سفر دو گھنٹے کا ہے۔ دونوں ملکوں کے وقت میں ایک گھنٹے کا فرق ہے۔ اوسلو ناروے کے جنوبی ساحل پر آباد ہے۔ خاصی دیر سمندر پر پرواز کے بعد جہاز جب بادلوں کی دھند کاٹتا ہوا نیچے اترنے لگا تو دور دور تک پانی سے گھری ہوئی پہاڑیوں کے سلسلے نظر آئے۔ سمندر نے جگہ جگہ زمین کو کاٹ دیا تھا اور چھوٹی چھوٹی جھیلیں بن گئی تھیں۔ پہاڑ زیادہ تر گھنے جنگلوں سے ڈھکے ہوئے دکھائی دیے۔ اترنے سے پہلے جہاز نے پورے اوسلو پر قوس سی بنائی۔ ہر طرف پہاڑیاں ہی پہاڑیاں، جھیلیں یا پھر عمارتیں ہی عمارتیں تھیں۔ تعجب ہوتا تھا کہ ان جھیلوں اور پہاڑیوں میں ایرپورٹ کہاں ہوگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے رگڑ سی محسوس ہوئی۔ جہاز رن وے پر بھاگ رہا تھا اور اگلے پہیے زمین سے لگ چکے تھے۔ جیسے ہی امی گریشن پاسپورٹ کاؤنٹر سے نکلا، ہرچرن چاولہ، مسز پورنیما چاولہ اور احباب پھولوں کے گلدستے لیے آگے بڑھتے دکھائی دیے۔ ہرچرن چاولہ افسانوں کے متعدد مجموعوں اور ناولوں کے مصنف ہیں، ان سے کہانیوں کے ذریعے ملاقات ہوتی رہتی تھی، لیکن یوں ملنے کا پہلا اتفاق تھا۔ چاولہ کی زرد رینال سے شفق گوں اوسلو ١٦ر اگست کی شام کو بہت بھلا معلوم ہوا۔

سڑکوں، مکانوں اور عمارتوں پر نظر پڑتے ہی احساس ہونے لگا کہ ناروے ترقی کی کس منزل میں ہے - چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر مکان صف در صف اوپر نیچے بنے ہوئے تھے اور جگہ جگہ بالکنیوں سے پھولوں کے بڑے بڑے خوشے جھانکتے ہوئے بھلے معلوم ہوتے تھے۔ تھوڑی دیر میں ہم چاولہ کے مکان پر تھے۔ یہ شہری انتظامیہ کے بنائے ہوئے لکڑی اور شیشے کے مکانوں کا نہایت کشادہ اور صاف ستھرا کمپلیکس تھا۔ بیچوں بیچ راستے اور روشیں، بالکنی سے لگے ہوئے ڈرائنگ روم اور ناروے کی سفید لکڑی سے بنے ہوئے اجلے اجلے دروازے اور کھڑکیاں۔ سکنڈے نیویا کا فرنیچر اپنی سادگی اور خوبصورتی کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ گھر کی زیبائش میں اس کی جھلک نظر آئی یک گونہ طمانیت اور مسرت کا احساس ہوا۔ ہرچرن چاولہ نے ناروے کی کونسل برائے تحقیقات تعلیمی اور تربیتِ اساتذہ، رائٹرز یونین، اوسلو یونی ورسٹی، اور دوسرے اداروں کی فرمائش پر جو پروگرام مرتب کیا تھا، اس کی نقل میرے حوالے کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اچھا ہوا کہ آپ چھ دن کے لیے یہاں ہیں ورنہ چار دن میں سب سے نمٹنا ناممکن تھا۔ صرف دو دن دوپہر بعد کا کچھ وقت سیر و سیاحت کے لیے رکھا ہے۔ ابھی ہم چائے پی رہے تھے کہ تنویر اسلم آگئے جو لاہور پاکستان کے ہیں۔ اور ہم سب تنویر کی گاڑی میں SKI JUMP دیکھنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ کئی پہاڑیوں سے گزرنے کے بعد ہم HOLMENKOLLEN پہنچے یہ پہاڑیوں کے دامن میں ایک نہایت اونچی اور کھلی جگہ ہے ایک خوشنما اور وسیع خطے میں SKI JUMP کی ہزاروں فٹ اونچی ریل لگی ہوئی تھی۔ سردیوں میں جب ہر جگہ برف ہی برف ہوگی تو سینکڑوں نوجوان سکی باندھ کر چوٹی سے پھسلتے ہوئے آئیں گے اور پھر آسمان میں تیرتے ہوئے ہزاروں فٹ نیچے جاکر گریں گے۔ سکی جمپ کے دونوں طرف شائقین کے اسٹینڈ تھے۔ کئی بل ڈوزر اور ٹریکٹر زمین ہموار کر رہے تھے اور راستہ بنا رہے تھے۔ بتایا گیا کہ ۱۹۸۲ء میں ونٹر اسپورٹس

یعنی تمام یوروپی ملکوں کے سردیوں کے کھیلوں کے مقابلے اوسلو میں ہوں گے اور اسی کی تیاری کا اہتمام ہو رہا ہے۔ یہاں سے ڈیڑھ دو میل آگے جاکر ایک خاص اونچی اور کھلی جگہ پر پرانی وضع کا لکڑی سے بنا ہوا ایک خوبصورت ریستوراں تھا جس کے سامنے SCANDINAVIA کے پانچوں ملکوں یعنی ناروے، سوئیڈن، ڈنمارک، فن لینڈ اور آئس لینڈ کے پرچم لہرا رہے تھے۔ یہ جگہ FROGNERSETEREN کہلاتی ہے۔ یہاں اوپر کی منزل میں ایک کشادہ دریچے کے قریب بیٹھ کر ہم بیر پیتے رہے۔ شام اتر آئی تھی، سورج سمندر کے پانیوں میں اور اس کے سینکڑوں عکس جھیلوں کے کٹوروں میں ڈوب رہے تھے۔ اوسلو شہر گھنے پیڑوں سے ڈھکی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور نیلی نیلی جھیلوں میں ایک جل پری سا گویا کہنی پر سر ٹکائے لیٹا ہوا تھا۔ جیسے جیسے دھندلکا بڑھتا گیا عمارتیں روشن ہوتی گئیں۔ روشنی میں سات رنگ ہوتے ہیں لیکن ایسے مناظر جب دل میں اترتے ہیں تو ہر رنگ سے سو رنگ بنتے ہیں اور فضا ہزاروں لاکھوں رنگوں سے بھر جاتی ہے۔ ناروے کی کھلی فضا سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

ناروے بہت بڑا ملک نہیں ہے، لیکن ایسا چھوٹا بھی نہیں۔ اس کا کل رقبہ ہندوستان کا دسواں حصّہ ہوگا لیکن ہندوستان کی کل آبادی ناروے کی آبادی سے ڈیڑھ سو گنا زیادہ ہے۔ اس کا کچھ اندازہ یوں ہوگا کہ سارے ناروے کی آبادی اکیلے دہلی کی آبادی کی دو تہائی ہے یعنی صرف چالیس لاکھ۔ ناروے کی زبان نارویجین کہلاتی ہے اس کے لکھنے کے دو معیار ہیں ایک وہ جس پر جرمن کا اثر ہے اور دوسرے وہ جو اس اثر سے صاف ہے۔ اسکولوں میں یہاں نارویجین کے علاوہ انگریزی اور جرمن زبانیں بھی پڑھائی جاتی ہیں۔ ناروے میں زیادہ تر لوگ انگریزی میں بات چیت کر سکتے ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد ناروے پانچ برس تک جرمنی کا غلام رہا۔ اسی لیے جرمنی کے خلاف

اب تک جذبہ پایا جاتا ہے۔ نیٹو اور بہت سے دوسرے فوجی معاہدوں میں ناروے کی شرکت کی وجہ یہی بتائی جاتی ہے۔ آبادی کی بہت بڑی اکثریت کرسچین LUTHERAN ہے اگرچہ کیتھولک لوگ بھی ہیں لیکن بہت کم۔ ہندوستان اور پاکستان سے آنے والے کل ملاکر دس ہزار سے زیادہ نہیں ہوں گے۔ اسکولوں میں مذہبی تعلیم اگرچہ اختیاری ہے لیکن نصاب کا ضروری حصّہ ہے۔ انگریزی اور جرمنی کے علاوہ ناروے کے رہنے والے اپنے پڑوسیوں DANES اور SWEDES کی زبانیں بھی جانتے ہیں، اور سوئیڈ FINNS زبان بولتے ہیں۔

ناروے یورپ کے شمال مغربی کنارے پر ایک لمبا تنگ اور پہاڑی قطعۂ زمین ہے۔ ناروے کا لفظی مطلب ہے شمال کی طرف جانے والا راستہ۔ آج سے کئی ہزار سال پہلے اس زمین کو تہہ در تہہ برف نے اس طرح ڈھانپ رکھا تھا جس طرح آج کل گرین لینڈ اور بیئرز برگن کے بہت سے حصے برف دوز ہیں۔ سکنڈے نیویا کے تمام علاقوں کو برف سے آزاد ہونے میں چھ ہزار سال لگے۔ برف پگھلنے کے بعد ناروے میں لوگوں کی آبادکاری کا آغاز ہوا۔ نارویجین لوگوں کی نسل کے بارے میں کئی رائیں ملتی ہیں۔ غالباً یہ لوگ جرمن النسل ہیں اور قدیم آریائی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا اصلی گھر ایشیا تھا اور ایشیا کا وہ علاقہ جو خوارزم اور بخارا کا خطّہ ہے۔ ناروے میں یہ لوگ دو راستوں سے داخل ہوئے ہوں گے، روس کے شمالی جزیرے کولا سے یا پھر وسطی یورپ سے ڈنمارک اور سویڈن کے راستے سے کیونکہ اس وقت ڈنمارک اور سویڈن ایک دوسرے سے منسلک تھے۔ شروع شروع میں ان کا پیشہ شکار کرنا اور مچھلیاں پکڑنا تھا۔

ناروے میں میرے خوشگوار تجربوں میں سے بنیادی تجربہ AUTHOR'S SOCIETY کا جلسہ تھا۔ RADHUSGATA میں AUTHOR'S SOCIETY کی اپنی عمارت اور اپنا نظام ہے۔ یہاں ڈھائی تین گھنٹے کی نشست رہی، پہلے گھنٹہ بھر

ہندوستان کی ادبی صورتِ حال اور ادبی مسائل پر میرا لیکچر ہوا اور اس کے بعد تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے اردو، ہندی شاعری، ناول، کہانی، تھیٹر، فلم کے بارے میں سوال و جواب کا سلسلہ رہا۔ اس میں ناروے کے متعدد شاعروں اور ادیبوں نے حصّہ لیا جن میں MARIA TAKVAM, THOR SØRHEIM, DOGEN KILEE, DAG LARSON, JOHN HENNINGER خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سیاہ کافی کا دور بھی چلتا رہا۔ یہاں ہر قابل ذکر ادیب اور شاعر سوسائٹی کا ممبر ہے۔ رکنیت کا فیصلہ انتظامیہ کرتی ہے جو ادیبوں اور شاعروں پر مشتمل ہے اور یہ ادبی کام اور تخلیقی حیثیت کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ حکومت کا کوئی نمائندہ ان فیصلوں پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ سماجی اثر و رسوخ اور سماجی حیثیت موافقت یا مخالفت کے لیے زیر غور نہیں آتی۔ سیدھا سا اصول ہے جب تک کسی ادیب یا شاعر کی کم از کم دو کتابیں شائع نہ ہو چکی ہوں وہ رکن نہیں بن سکتا۔ ادیبوں اور شاعروں کے جلسے اسکولوں، کالجوں، یونی ورسٹیوں اور قومی تھیٹروں میں سوسائٹی ہی کے زیر اہتمام ہوتے ہیں اور ہر جلسہ، تقریر یا مضمون کے لیے معقول معاوضہ دیا جاتا ہے۔ مجھ سے ہندوستان میں ادیبوں کی حالت، ہندی اور اُردو کا فرق، سنسکرت کی موجودہ حیثیت، بنگالی اور تامل کی انفرادی حیثیت، ادیب کی ذہنی آزادی، سیاسی نشیب و فراز، حکومتوں کی تبدیلی، غزل کی مقبولیت، ہندوستان کی وسیع فلم انڈسٹری، اور ستیہ جیت رے کی شاعرانہ فلموں کے بارے میں طرح طرح کے سوالات انتہائی تجسس سے کیے گئے۔ میں نے ناروے کے ادیبوں اور شاعروں، موجودہ تخلیقی رجحانات اور ذہنی رویّوں کے بارے میں معلومات چاہیں۔ ناروے کے ادیبوں کو اپنی آٹھ سو سالہ پرانی ادبی روایت پر فخر ہے، ان کا قدیم ادب زیادہ تر رزمیوں پر مشتمل ہے جو بہادر اور دلیر مردوں اور حوصلہ مند عورتوں کے ذکر سے بھرا ہوا ہے۔ نارویجین ادب کا سُنہرا دور اٹھارہویں صدی کے نصف دوم سے تعلق

رکھتا ہے جب HENRIK IBSEN, BJØRNSTJARNE BJØRNSON, ALEXANDER KIELLAND, JONAS LIE جیسے ادیبوں کی تخلیقات سامنے آئیں۔ ابسن کے ڈرامے تو ہندوستان کی تقریباً تمام زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ AUTHOR'S SOCIETY کے علاوہ ناروے میں ادیبوں کی کچھ اور تنظیمیں بھی خاصی فعال ہیں۔ یہ تنظیمیں نہ صرف ادیبوں اور شاعروں کے حقوق کا خیال رکھتی ہیں بلکہ تخلیقی کاموں میں معاون بھی ثابت ہوتی ہیں۔ ناروے میں عام قاعدہ ہے کہ جب بھی کوئی معیاری کتاب شائع ہوتی ہے، حکومت اس کی ایک ہزار جلدیں لائبریریوں کے لیے خرید لیتی ہے۔ مصنف کو بیس فیصد رائلٹی دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک ہزار سے زیادہ جتنی بھی جلدیں فروخت ہوتی ہیں، منافع کا ایک تہائی مصنف کو دیا جاتا ہے۔ ناروے کے بارونق حصّوں اور بازاروں میں گھومنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ ناروے کے لوگ کتابوں سے محبت کرتے ہیں کیونکہ جگہ جگہ میں نے کتابوں کی دکانیں دیکھیں۔ بے ساختہ اس صورتِ حال کا مقابلہ میں نے امریکہ سے کیا۔ امریکی گھروں میں کتابیں تو دکھائی دے جاتی ہیں، لیکن زیادہ تر سجاوٹ کے طور پر یا انسائیکلو پیڈیا کی قطاریں۔ پورا پورا شہر گھوم جائیے سنجیدہ کتابوں کی دکان آسانی سے نہیں ملے گی۔ مبارکباد کے کارڈوں، عاشق و معشوق کے راز و نیاز کے چھپے ہوئے تجارتی رقعوں، مزاحیہ خاکوں اور بے باک جسمانی نمائش کی تصویروں کی دکانیں تو ہر کونے پر مل جائیں گی، لیکن اگر کوئی علمی کتاب خریدنی ہو تو یونی ورسٹی کیمپس کا رخ کرنا پڑے گا۔ یوں تو مغرب میں طباعت ہر کہیں اچھی ہوتی ہے لیکن جرمنی اور ہالینڈ کے علاوہ ناروے، سویڈن اور ڈنمارک بھی اعلیٰ طباعت کے لیے مشہور ہیں، خاص طور پر رنگین طباعت کے لیے۔ دنیا کا بہترین کاغذ آسٹریلیا، ناروے اور سویڈن میں بنتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کتابیں خاصی گراں ہیں، لیکن گرانی عالمگیر ہے، کتابوں کے دام ہر جگہ بڑھ گئے ہیں۔ ناروے

میں تقریباً سو صفحے کی کتاب ۹۰،۸۰ کرونر یعنی دو سو روپے کی فروخت ہوتی ہے لیکن اس کا یہ فائدہ بھی تو ہے کہ ایک کتاب کی اشاعت سے مصنف کو تقریباً تیس پینتیس ہزار روپے مل جاتے ہیں۔ معاوضے کی ایک خاص شکل اور بھی ہے جس کا رواج شاید صرف سکنڈے نیویا میں ہے یہ پبلک لائبریریوں کی طرف سے ملنے والا معاوضہ ہے یعنی ہر مصنف یا شاعر کو ہر اس کتاب کے لیے جو کسی لائبریری میں رکھی جاتی ہے اور زیر استعمال ہے، لائبریری اس کے لیے ہر سال پانچ سو کرونر یا ایک ہزار روپے ادا کرتی ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ آمدنی اگر ایک خاص شرح سے بڑھ جائے تو ۶۵ فیصد آمدنی ٹیکس بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔

ناروے میں رہنے بسنے والے دس ہزار ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے بچوں کے لیے اسکولوں میں اردو اور ہندی تعلیم کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ یہ تعلیم والدین کی مرضی اور بچے کی خواہش پر اسکول کے کسی بھی درجے میں دی جاسکتی ہے۔ اس کے لیے تقریباً تیس اساتذہ کا تقرر ہوا ہے۔ وہاں کی تعلیمی کونسل برائے تربیتِ اساتذہ درس و تدریس کے نئے نئے طریقوں پر غور و خوض کرتی رہتی ہے۔ اس سلسلے میں "ہندی اردو کی تاریخ، ہندوستان پاکستان میں ان زبانوں کی حیثیت، ان دونوں کا صوتی، صرفی و نحوی اشتراک اور اختلاف" اس موضوع پر ایک جامع رہنما مقالہ لکھنے کا کام میرے سپرد ہوا تھا۔ یہ سلسلہ میرے قیام کے دوران برابر جاری رہا۔ نئے نئے سوال و نکات سامنے آتے رہے اور ورک شاپ کی صورت میں ان پر بحث و مباحثے اور افہام و تفہیم کا کام چلتا رہا۔ بعد میں یہ مقالہ MODERN LANGUAGE ASSOCIATION OF NORWAY کے رسالے SPRAK OG SPRAKUNDERVISNING کے جنوری ۱۹۸۲ء کے شمارے میں THE ORIGIN, STATUS, SIMILARITIES & DIFFERENCES OF URDU & HINDI کے عنوان سے شائع ہوا تاکہ ناروے میں ان دونوں زبانوں کے

اساتذہ استفادہ کرسکیں۔ ہرچرن چاولہ نے پروگرام اس خوش اسلوبی سے وضع کیا تھا کہ چند دن کی قلیل مدّت میں سینکڑوں لوگوں سے ملاقات ہوگئی اور سب سے بڑی بات یہ کہ ناروے کے ادیبوں، شاعروں اور دانشور طبقے کے اس کراس سیکشن سے بھی جس میں وہاں بسے ہوئے ہندوستان اور پاکستان کے اہلِ علم اور ادیب بھی شامل ہیں۔

ناروے کے اخباروں میں انٹرویو کا طریقہ یہ ہے کہ انٹرویو وہ شخص کرتا ہے جو بین الاقوامی معاملات یا ایشیا کا ماہر ہو یا پھر خود ادیب یا عالم ہو۔ AFTENPOSTEN آفتن پوستن ناروے کا سب سے بڑا اخبار ہے جو ڈھائی تین لاکھ فروخت ہوتا ہے۔ اس اخبار کے لیے انٹرویو کا سلسلہ دو گھنٹے تک جاری رہا۔ انٹرویو کے ساتھ انھوں نے میرا مضمون INFLUENCE OF ISLAMIC MYSTICISM ON URDU POETRY بھی اشاعت کے لیے حاصل کیا۔ معاوضہ بارہ سو کرونر یعنی چھبیس ستائیس سو روپے ایک لفافے میں رکھ کر اس معذرت کے ساتھ پیش کیا گیا کہ آپ کو زحمت تو ہوگی ایک دفتری کارروائی کی تکمیل ضروری ہے، اس چھوٹی سی رسید پر آپ کے دستخط کی ضرورت ہے۔ آفتن پوستن لبرل پارٹی کا ترجمان ہے۔ برطانیہ کی طرح یہاں بھی دو خاص پارٹیاں ہیں۔ دائیں بازو کی پارٹی اور بائیں بازو کی پارٹی۔ سوشلسٹ پارٹی یہاں آربائیدر پارٹی کہلاتی ہے۔ ایوان شاہی سے قومی تھیئٹر تک شہر کے مرکزی حصّے کی پر رونق اور ہنگامہ خیز مال پر گھومنے سے معلوم ہوا کہ انتخابات قریب ہیں۔ جگہ جگہ دونوں سیاسی پارٹیوں کے بوتھ بنے ہوئے تھے اور اشتہار اور بلّے تقسیم کیے جارہے تھے۔ تقریر بازی یا ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے کا منظر کم از کم بازار اور بازار سے ملحقہ پارکوں اور روشوں پر مجھے نظر نہیں آیا۔ تقریر بازی کے بجائے بینڈ باجے اور گانے بجانے کا پروگرام تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع تھے اور بینڈ کی دھنوں پر مست تالیاں بجارہے تھے۔

دوسرا انٹرویو سوشلسٹ پارٹی کے اخبار ARBEIDER BLADET آربائیدر بلادے کے کلچرل سیکشن کے ایڈیٹر ULF RENBERG نے لیا۔ وہیں کمرے میں چائے تیار ہوئی اور کاغذ کے گلاسوں میں بغیر دودھ کے پیش کردی گئی۔ گفتگو میں علمی، ادبی، لسانی، سماجی، سیاسی، ثقافتی ہرطرح کے سوال پوچھے گئے۔ اخبار کا اپنا اسٹوڈیو اسی عمارت میں تھا وہاں تصویریں کھنچ گئیں۔ انھوں نے

THE ROLE OF URDU IN INDIAN FREEDOM STRUGGLE

پر میرے مضمون کی فرمائش پہلے سے کردی تھی - یہ انٹرویو اور مضمون نارویجین زبان میں ترجمہ ہوکے

JORDSKJELV BAK ROMANTIKKEN : POLITIKKEN INN I INDISK DIKTNING

کے عنوان سے دو قسطوں میں شائع ہوا یعنی " رومانیت کے زیرسطح زلزلہ : تحریک آزادی اور ہندوستانی ادب " آربائیدر بلادے میں بھی تقریبًا اتنا ہی معاوضہ پیش کیا گیا۔ باتوں باتوں میں میں نے آنے والے انتخابات میں آربائیدر پارٹی کی پوزیشن کے بارے میں سوال کیا تو معلوم ہوا کہ پارٹی تقریبًا تیس برس سے حکومت کررہی ہے لیکن اب وقت آگیا ہے کہ شاید لبرل پارٹی کو فتح حاصل ہو۔ یہ پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی، اور چند روز بعد مجھے معلوم ہوگیا کہ لبرل پارٹی جیت گئی ہے۔

ناروے ایک جمہوری فلاحی ریاست WELFARE STATE ہے۔ برطانیہ کی طرح یہاں بھی بادشاہت محض ایک ثقافتی مظہر ہے۔ سکنڈے نیویا کے تمام ملکوں میں فلاحی ریاستیں قائم ہیں جن کا پارلیمانی نظام براہِ راست انتخابات پر قائم ہے یعنی جو بھی سیاسی جماعت انتخابات میں پارلیمنٹ کی آدھی سے زیادہ نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے، اسے حکومت بنانے کا اختیار ہے۔ ناروے میں مقیم ہزاروں پاکستانیوں اور ہندوستانیوں نے بھی ستمبر میں یہاں پارلیمنٹ کے انتخابات میں حصہ لیا اور اپنے ووٹ کے حق کا استعمال

کیا۔ کہنے کو تو بہت سے ملک فلاحی ریاست کا لقب استعمال کرتے ہیں، خود ہندوستان میں ہم بھی اس طرح کا دعوا کرتے ہیں اور SOCIALISTIC PATTERN OF SOCIETY کی بنیاد گزاریوں کی سعادت مندیوں سے بہرہ اندوز ہوتے رہتے ہیں، لیکن فلاحی ریاست کیا ہوتی ہے اور عوام کے لیے اور دانشوروں کے لیے کیا کرتی ہے، اسے صحیح معنوں میں میں نے یہیں آکر دیکھا اور پہچانا۔ سچا جمہوری نظام، کھلے براہ راست انتخابات، مکمل سیاسی آزادی، تحریر و تقریر اور اظہار خیال کی آزادی، اور پارلیمانی طرز حکومت۔ ناروے میں امیر و غریب کا وہ فرق نہیں جو ایشیائی ملکوں میں دیکھنے میں آتا ہے۔ عام معیار زندگی بلند ہے پٹرول کی دریافت کے بعد ناروے کی معاشیات پر اور اچھا اثر ہوا ہے۔ لکڑی اور کاغذ کی صنعت کے لیے تو ناروے دنیا بھر میں مشہور ہے ہی۔ اس کے علاوہ معدنیات میں چاندی اور مصنوعات میں شیشے کا سامان بکثرت تیار ہوتا ہے۔ ناروے کے قدرتی مناظر، برف پوش وادیوں اور سمندروں سے ملی ہوئی جھیلوں میں اتنی کشش ہے کہ جتنی ناروے کی کل آبادی ہے اتنے ہی یعنی چالیس لاکھ سیاح ہر سال ناروے آجاتے ہیں۔ یہاں ہر شخص بر سر روزگار ہے۔ طرح طرح کی سماجی مالی مدد لوگوں کو ملتی ہے۔ سڑسٹھ سال کی عمر کے بعد سب باشندوں کو خواہ وہ سرکاری ملازم رہے ہوں یا نہیں، حکومت کی طرف سے تاحیات پنشن ملتی ہے۔ ٹیکس زیادہ ہیں لیکن چونکہ آمدنی خاصی ہے، ٹیکس آمدنی کے تناسب سے ہیں۔ ہر شخص کا اپنا مکان ہے یا کوٹھی ہے۔ ہر گھر میں کار ہے اگر کوئی شخص بیمار ہو جائے، دوا یا ڈاکٹر کی ضرورت ہو تو علاج معالجے اور اسپتال کا خرچ مفت ہے یعنی اس کا انتظام ہر باشندے کے لیے سرکار کی طرف سے ہے۔

اوسلو یونی ورسٹی کے انڈو ایرانین انسٹی ٹیوٹ میں PROF. SIMENSON, PROF. PER KVAERNE اور ان کے رفقا کے ساتھ نشست رہی۔ ہنس مکھ INGRID NYMON سے یہاں دوبارہ ملاقات ہوئی اور اس نے رہنمائی کی۔ اردو

ہندی کے تدریسی انتظامات واجبی سے تھے، اوران میں بہتری کی خاصی گنجائش تھی۔ زیادہ تر ماہرین قدیم ہندیات میں ڈوبے ہوئے نظر آئے۔ یہاں ایک بری چہرہ ذہین بنگالی لڑکی سے بھی ملاقات ہوئی جس کی ماں نارویجین ہے اور باپ ہندوستانی۔ یہ لڑکی اسکالروں کی ایک ٹیم کے ساتھ مل کر نارویجین ہندی لغت پر کام کر رہی تھی۔ نارویجین اردو لغت کا منصوبہ بھی زیر غور ہے۔

یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ ناروے کے سماج میں شاعروں اور ادیبوں کی بڑی قدر و منزلت ہے۔ حکومت اور انجمن ادیبوں کو طرح طرح کی سہولتیں بہم پہنچاتی ہیں، اور وظائف دیتی ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ پچاس ہزار کرونر سالانہ کے بیس وظائف ہر سال مصنفین کو دیے جاتے ہیں اور جب تک بھی کوئی شخص لکھتا پڑھتا رہے وہ وظیفے سے مستفید ہو سکتا ہے۔ رائٹرز سوسائٹی، اوسلو یونی ورسٹی، اخباری انٹرویو اور احباب کے گھروں پر منعقد ہونے والی تقریبات میں مجھے برابر یہ معلوم ہوتا رہا کہ ادیبوں شاعروں کے لیے مالی امداد کی کوئی کمی نہیں۔ مستقل وظائف کے علاوہ عام کام کرنے والوں کے لیے تین تین سال اور ایک ایک سال کے وظائف بھی ہیں۔ علمی سفر اور تحقیقی کام کے لیے طرح طرح کی سہولتیں موجود ہیں۔ اور تو اور میونسپلٹیاں بھی مالی امداد فراہم کرتی ہیں اور شاعروں اور ادیبوں کو وظائف کے لیے نامزد کرتی ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ناروے کے ادب میں ہمت و ولولے کی لہر، اور اعتماد کی روشنی ملتی ہے۔ پانچویں دہائی میں دفتر شاہی کے خلاف جذبہ پیدا ہوا، اور چھٹی دہائی میں بائیں بازو کے باغی ادب کا رجحان سامنے آیا۔ مجھے بتایا گیا کہ دس پندرہ برس تک ادبی منظر پر یہی لوگ چھائے رہے اور ادب میں اہمیت حاصل کرنے کے لیے سیاسی معنویت پر اصرار کیا جانے لگا۔ ساتویں دہائی میں نئے لکھنے والوں میں ماؤسی تنگ کا اثر زیادہ تھا۔ ادھر آٹھویں دہائی میں ادب کی ادبیت پر، زندگی کی بصیرت پر اور دکھ سکھ، محبّت، نفرت کی دھوپ چھاؤں کے تمام رنگوں پر توجہ پھر سے ہونے لگی ہے۔ ادب میں سیاسی طور پر فعّال لکھنے والوں

کی یقیناً گنجائش ہے لیکن ادب محض سیاسی نظریوں کے زور پر پیدا نہیں ہوتا، یہ احساس عام ہورہا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ نارویجین ادب کے موجودہ موضوعات میں عام سماجی مسائل، مرد کے مقابلے میں عورت کی حق تلفی، اقلیتوں کے حقوق، جسمانی طور پر معذور انسانوں کے احساسات، شدید نوعیت کے امراض، موت کا خوف جس پر انسان قابو نہیں پاسکا، فطرت، چاند ستاروں، پہاڑوں، دریاؤں، انسانی حسن کی کشش اور محبّت کی پاسداری اور انسانی نفسیات کی باریکیوں پر زیادہ توجہ ہے۔ شاعری اور ناول کی سرحد دھندلا چکی ہے اور ایسے ناول عام لکھے جاتے ہیں جن میں شاعرانہ نثر استعمال کی جاتی ہے۔ ناولوں میں مستند پس منظر، تاریخی شخصیات یا ایسے کرداروں کا ذکر مستحسن سمجھا جاتا ہے جو غیر معمولی، پرکشش یا دلچسپ ہوں۔

اوسلو سے اردو کا ایک حسین وجمیل ماہنامہ کارواں KARAVANE نکلتا ہے جس کے ایڈیٹر سید مجاہد علی ہیں۔ یہ رسالہ آفسٹ پر شائع ہوتا ہے۔ اس کا پہلا شمارہ اسی زمانے میں منظر عام پر آیا تھا۔ "کارواں" کے لیے سید مجاہد علی نے مجھ سے دو تین گھنٹے کا تفصیلی انٹرویو لیا تھا جو اکتوبر کی اشاعت میں "اردو باغیوں کی زبان" کے عنوان سے شائع ہوا۔ سید مجاہد علی باصلاحیت آدمی ہیں۔ صحافت کی ابتدائی تربیت انھوں نے پاکستان میں حاصل کی۔ اس کے بعد اوسلو میں برسوں تارکینِ وطن کے مسائل پر نارویجین اور انگریزی زبانوں میں کالم لکھتے رہے۔ بعد میں اپنا رسالہ نکالا۔ "کارواں" میں ناروے کی تاریخ، سیاست اور ثقافت پر مضامین شائع ہوتے ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان کی ادبی خبریں بھی شامل کی جاتی ہیں۔ اخبارِ عالم کے تحت دنیا بھر کی خبریں دی جاتی ہیں۔ مکتوبِ لندن میں برطانیہ کے حالات پر تبصرہ ہوتا ہے۔ دیارِ ہند کے نام سے رام لعل ہندوستان میں اردو کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ناروے کے سیاسی نظام پر انیس احمد، جو ریڈیو ناروے کے اردو پروگرام کے پروڈیوسر ہیں، معلومات افزا مضمون لکھتے رہتے ہیں۔ سید مجاہد علی کی بیگم یاسمین عارفی نہایت باسلیقہ اور باصلاحیت خاتون ہیں۔ رسالے میں

بہنوں کا صفحہ یاسمین خود لکھتی ہیں۔ سید مجاہد علی اور ان کے احباب سے کئی ملاقاتیں رہیں۔ رسمی بھی اور غیر رسمی بھی اور ان حضرات کی اردو دوستی، اور لگن سے بہت متاثر ہوا۔ وہاں کی سب سے بڑی لائبریری DEICH MANSKE BIBLIOTEK میں بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ یہاں اردو ہندی پنجابی کی کتابوں کا الگ سیکشن ہے۔ کتب خانے کے چیف HANS FLØGSTAD نے ظہرانہ دیا اور لائبریری کی تاریخ اور کارکردگی پر روشنی۔ چاولہ اسی لائبریری میں شعبۂ اردو کے نگراں ہیں۔

ناروے میں سفارت خانۂ ہند کے سربراہ ان دنوں بھنڈاری صاحب تھے۔ انھوں نے پذیرائی کا حق ادا کر دیا۔ ہفتے کے روز اردو کی ادبی انجمن اور ہندی والوں کی ساہتیہ وچار سبھا کی طرف سے مشترکہ استقبالیہ تھا جس میں ہندوستانی پاکستانی ادیبوں اور اردو ہندی سے محبت رکھنے والوں نے بہت بڑی تعداد میں شرکت کی۔ ہرچرن چاولہ اور ان کی بیگم کی شخصیت ایسی ہے کہ دونوں طرف مقبول ہیں اور دونوں انجمنوں کے کاموں میں شریک ہوتے ہیں۔ یہ مشترکہ جلسہ بھی تین چار گھنٹے چلا اور اردو کی تہذیبی اہمیت اور ہندی اردو کے لسانی رشتے اور ہندوستان پاکستان میں اردو کی موجودہ صورتِ حال پر میرے لیکچر کے بعد دیر تک سوال وجواب کا سلسلہ رہا جس میں زیادہ تر پاکستان میں اردو کے قومی موقف اور علاقائی زبانوں بالخصوص پنجابی اور سندھی کے مسائل اور مادری علاقائی زبانوں کی حق تلفی کے مسائل زیر بحث رہے۔

علمی ادبی پروگراموں سے ہٹ کر کچھ وقت ایسا ملتا رہا کہ سمندر کے کنارے کی سیر، سٹی ہال کی مجسمہ سازی اور مرکزی ہال کی تفریح گاہ سے بھی لطف اندوز ہو سکوں' لیکن ناروے کے قدرتی مناظر کو صحیح معنوں میں دیکھنے کا موقع اتوار کو نصیب ہوا جب دن بھر کے لیے ہم SIGURD MURI اور ان کی بیگم کے مہمان تھے اور وہ ہمیں دو ڈھائی سو میل جنوبی ناروے کے قابل دید مقامات کی سیر کرانے کے لیے لے گئے۔ سیگور موری مصنف بھی ہیں، مصور بھی اور شاعر بھی۔ کئی ناولوں اور شاعری کے

مجموعوں کے خالق ہیں۔ان کی رہائش گاہ کی وضع قطع اور آرائش و زیبائش دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔پہاڑی کی ڈھلان پر لکڑی سے بنا ہوا دیدہ زیب مکان دیکھنے اور دل میں بسانے سے تعلق رکھتا تھا۔کچھ دیر ہم پائیں باغ میں ٹہلتے رہے، موری اور ان کی بیگم نے پیڑوں سے سیب اور آلوچے توڑے اور ہم سب نے مل کر نوش کیے۔ اوسلو سے باہر نکلنے پر کئی میل تک موٹر ایک پہاڑی ندی کے کنارے کنارے چلتی رہی۔پھر DRAMMER کی پوری بستی دامان کوہ میں سوتی ہوئی نظر آئی۔ دوسری طرف پہاڑ کی چوٹی کا راستہ ایک سرنگ سے تھا جو گول دائرہ کاٹتی ہوئی اوپر چڑھتی ہے۔مسلسل چکر کاٹتے رہنے سے یوں محسوس ہوتا تھا گویا یہ سرنگ یوں ہی ہفت آسمان تک پہنچ جائے گی۔چوٹی پر پہنچ کر نیچے بہتی ہوئی ندی کا پانی چاندی کے تار سا چمک رہا تھا۔ ہرے بھرے پہاڑ گھنے پیڑ اور چاروں طرف سرسراتی وادیاں۔ ناروے ریڈیو کا اُردو پروگرام جو ہر اتوار صبح نشر کیا جاتا ہے ہم نے یہیں پہنچ کر سنا۔کچھ دیر کے سفر کے بعد ہم ناروے کی ایک عجیب و غریب عمارت کے سایے میں کھڑے تھے۔ یہ پیڑوں کے تنوں کو کاٹ کر بنایا گیا آٹھ سو سال پرانا ایک چرچ تھا جو آج بھی انسانی عزم واستقلال اور عقیدت و ولولے کی شہادت دے رہا تھا۔ناروے میں کچھ تو لکڑی کی فراوانی کی وجہ سے اور کچھ سردی کی شدت کی وجہ سے عمارتوں اور مکانوں میں لکڑی کا خوب استعمال ہوتا ہے۔ایک دو دن پہلے جو FOLK MUSEUM دیکھا تھا اس میں بھی صدیوں پرانے مکانوں کی ساخت کچھ ایسی ہی تھی۔اور لکڑی کے کام کی مہارت کا اندازہ ان کشتیوں سے بھی ہوا تھا جن کے سات آٹھ صدی پرانے اصل ڈھانچے میوزیم میں رکھے گئے تھے اور جنھیں ناروے کے VIKING بحری قزاق یوروپی سمندری راستوں میں لوٹ مار کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔چرچ کے باغ میں قبرستان تھا جس کا ہر قطعہ یا گوشہ کسی نہ کسی خاندان کے لیے محفوظ تھا۔ ہر جگہ پھولوں کے تختے تھے۔کہیں گلاب کہیں نیلوفر کہیں نرگس کہیں داؤدی اور کہیں سوسن۔ بنفشہ اور IVY کی بیلیں

چڑھی ہوئی تھیں۔ مسز موری نے بتایا کہ اب جگہ کی تنگی کے پیش نظر عیسائیوں میں یہ رواج ہو رہا ہے کہ لاش کو برقی CREMATORIUM میں جلا دیا جاتا ہے اور راکھ قبرستان کے نشان زد خاندانی قطعے میں دفن کر دی جاتی ہے۔

ہمارا اگلا پڑاؤ پہاڑ کی ایک ایسی چوٹی تھی جس کا راستہ نہایت پیچیدہ اور دشوار گزار تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ موری کا ایک پیر ہر طرح کی حس سے عاری ہو چکا ہے تو میرے تعجب کی انتہا نہ رہی کہ انھوں نے ایسے دشوار گزار راستے میں کار کیسے چلائی اور اسے قابو میں کیسے رکھا۔ ایک ایک گھنٹے کے وقفے سے موری اور ان کی بیگم ڈرائیونگ بدل لیتے تھے اور اس طرح دو ڈھائی بجے ہم لوگ کلاہِ کوہ پر پہنچ گئے جہاں گھرے سبز پیڑوں پر بادل جھکے ہوئے تھے۔ کھلی ہوئی دھوپ میں ناروے کے نوجوان لڑکے لڑکیاں اپنے بدن سکھا رہے تھے۔ یہاں ایک نہایت خوشنما ریستوراں تھا جس میں ہم لوگوں نے کچھ دیر آرام کیا، انواع و اقسام کا کھانا اور ارغوانی نشاطِ روح۔ دن بھر کی مسافت اور تھکن کے بعد نہایت عمدہ کھانے اور اربابِ اخلاص کی روح پرور صحبت باری تعالیٰ کی اعلاترین نعمتوں کا درجہ رکھتی ہے۔ واپس آتے آتے شام ہو گئی۔ چاولہ کے صاحبزادے شیکھر کو اسی رات شمالی ناروے کے لیے پرواز لینی تھی جہاں اگلے دن اس کی یونی ورسٹی کھل رہی تھی لیکن راستے میں فون کرنے پر معلوم ہوا کہ جہاز میں جگہ اگلے دن ملی ہے۔ پس ہم کمال اطمینان اور بے فکری سے اپنے مستقر پر پہنچے۔ انیس احمد مع احباب کے گھر پر آ گئے اور انھوں نے NRK ریڈیو ناروے کی اردو سروس کے لیے انٹرویو اپنے ٹیپ ریکارڈ پر صدا بند کر لیا۔ مسز راج پاٹھک نے ناروے کے ہندی رسالے "پہچان" کے لیے انٹرویو لیا جو نومبر کے شمارے میں شائع ہوا۔

چھ دن پلک جھپکتے میں گزر گئے اور مصروفیت کا یہ عالم رہا کہ پورنیما چاولہ نے گلہ کیا کہ سب سے ملنا ملانا ہوتا رہا لیکن گھر تو آپ اطمینان سے بیٹھے ہی نہیں، آخری دوپہر ہم نے اوسلو کے مشہور پارک FROGNER PARK میں نارویجین مجسمہ ساز

GUSTAV VIRGELAND کے فن کے نمونوں کو دیکھنے میں بسر کی۔ میں ایتھنز بھی جا چکا ہوں اور وینس و روم بھی۔ یونان اور اطالیہ میں مجسمہ سازی کی اپنی روایت ہے لیکن کسی ایک باغ میں مجسموں کی ایسی کثرت اور چھوٹی بڑی شبیہوں کی ایسی ریل پیل اس سے پہلے نہ دیکھی تھی۔ لگتا تھا مجسمہ ساز کے تخیّل نے بھری آبادیوں اور پوری کی پوری انسانی بستیوں کو از سرِ نو خلق کیا ہے۔ چاروں طرف بھرپور بدن والی باوقار اور پُرتمکنت شبیہیں تھیں جن میں جلال و جمال کی کیفیتیں گھل مل کر عجب منظر دکھاتی تھیں۔ بیچوں بیچ ایک مینارہ تھا جس میں پوری خلقت روزِ آفرینش سے آج تک کی سرگرمیوں میں مصروف انگڑائیاں لیتی ہوئی ایک نسل سے دوسری نسل تک ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، موج در موج بہتی ہوئی نظر آتی تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ ۲۳ر اگست کی شام کو ناروے کے سفر پر سورج ڈوب رہا تھا۔ پرواز تیار تھی۔ احباب کے دیے ہوئے پھولوں کو ہاتھوں میں دبائے جو مدتوں یادوں کے گلدانوں میں مہکتے رہیں گے، میں نے سب کو خدا کے حوالے کیا، اور وقت کی لمبی غلام گردش سے نیچے اتر کر دیکھا، ایک پوری دنیا نظروں سے اوجھل ہو رہی تھی، ایک پوری دنیا نظروں کے سامنے ابھر رہی تھی۔

تبسّمِ گل فرصتِ بہار

لندن میں آخری دن میرے لیے بڑی آزمائش کا تھا۔ لندن کہنے کو شہر ہے، لیکن ایک پوری تہذیب، ایک پوری تاریخ، علم وادب اور دانش وری کی ایک پوری روایت کا مظہر بھی ہے۔ اٹلانٹک میں اُکڑوں بیٹھے ہوئے ایک چھوٹے سے جزیرے میں دھڑکتا ہوا یوروپ کا دل سا۔ تاریخ نے صدیوں کے ورق پلٹ دیے لیکن لندن آج بھی جوان ہے۔ بین الاقوامی تحریکیں خواہ وہ ایشیائی افریقی ہوں، فرانسیسی، یوروپی یا امریکی، یہاں سب کی آویزش و پیکار دیکھی جا سکتی ہے۔ لندن آج بھی دنیا کی ایسی شہ رگ ہے جس سے اس کرۂ ارض کی تمام شریانوں میں تازہ علمی، ادبی، فکری، سماجی، سیاسی افکار کا نیا خون کسی نہ کسی طرح پہنچتا رہتا ہے۔ یہ تاریخ کی ستم ظریفی نہیں تو کیا ہے کہ انگریزوں کو ہم نے برِصغیر سے کھدیڑ دیا اور خود لاکھوں کی تعداد میں آکر لندن اور اس کے نواح میں بس گئے۔ پچھلے دنوں لندن میں اردو کی کیسی کیسی شخصیتوں سے ملاقات ہوئی۔ بار بار محسوس ہوا کہ MAINLAND سے باہر لندن بھی تو اردو کا ایک گہوارہ ہے۔ اردو کے کئی ادیب اور شاعر یہاں آکر بس گئے ہیں۔ فکر و اظہار کی ایسی فضا ہے کہ جو آتا ہے یہ زمین اس کی جڑیں قبول کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتی۔ غور کیجیے جس شہر میں فیض احمد فیض آتے جاتے رہتے

ہوں ، جہاں ساقی فاروقی اور زہرہ نگاہ بستے ہوں ، جہاں عبداللہ حسین، مشتاق احمد یوسفی ، الطاف گوہر، اور افتخار عارف جیسی شخصیتیں آباد ہوں ، جہاں عاشق حسین بٹالوی ، رالف رسل ، ڈاکٹر فاخر حسین ، خالد قادری ، ڈیوڈ میتھیوز ، ڈاکٹر ضیاالدین شکیب اور ڈاکٹر زوار حسین زیدی جیسے اہلِ قلم اردو کے لیے عرق ریزی کرتے ہوں ، جہاں اکبر حیدرآبادی ، حبیب حیدرآبادی ، اطہر راز ، سوہن راہی ، محسن شمسی ، بلونت کپور، راج کھیتی جیتندر بلو ، محسنہ جیلانی جیسے ادیب، شاعر اور تخلیق کار اردو کی محفلیں آباد رکھتے ہوں ، جہاں وقار احمد ، اطہر علی ، وسیم صدیقی اور یونس واسطی بی بی سی کی اردو سروس سے وابستہ ہوں ، جہاں سے اردو کے ایک سے زیادہ روز نامے اور متعدد ماہنامے اور رسائل نکلتے ہوں ، جہاں چپے چپے پر اردو کی انجمنیں ، ادارے اور مجلسیں ہوں ، وہ شہر اردو کا بین الاقوامی گہوارہ کیوں کر نہ ہو گا - یہاں تفرڈ ورلڈ فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام جو اردو مرکز کھولا گیا ہے ، وہ ہر لحاظ سے لندن کے شایانِ شان ہے - بلکہ ایسا مرکز اگر لندن میں نہ ہوتا تو تعجب کی بات تھی - افتخار عارف نے ۲۵ ر اگست کے پروگرام کا پہلے سے اعلان کر دیا تھا - لندن یونی ورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز میں ڈاکٹر ضیاالدین شکیب نے تمام انتظامات مکمل کرا دیے تھے - طے پایا تھا کہ صدارت فیض احمد فیض فرمائیں گے - موضوع تھا " ہندوستان میں اردو : شاعری کے نئے رجحانات " میری مشکل یہ تھی کہ بہت سے بچے ہوئے کام اسی دن کرنے تھے - کتابوں کے پیکٹ تیار کر کے بھجوانے تھے ، بینک کا کام تھا ، ریزرویشن کی توثیق کرانی تھی ، لنچ سے پہلے بی بی سی کی اردو سروس کے لیے ریکارڈنگ تھی - ہندی سروس کے لیے چار بجے کا وقت مقرر تھا - اور اس سب سے نمٹ کر لندن یونی ورسٹی پہنچنا تھا -

شام کو جب تھک تھکا کر اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز میں پہنچا تو آڈی ٹوریم آخری نشستوں تک بھر چکا تھا - لابی میں بھی خاصا ہجوم تھا - فیض صاحب تشریف رکھتے تھے - میرے پہنچتے ہی جلسہ شروع ہو گیا - نظامت افتخار عارف

نے کی۔ استقبالیہ کلمات ساقی فاروقی نے کہے۔ پورا ہال سامعین سے لبریز تھا، لندن کے علاوہ برمنگھم، مانچسٹر، آکسفورڈ، ڈارٹ فورڈ کہاں کہاں سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ میں نے تقریباً ایک گھنٹے تک خطاب کیا اور اردو کے بین الاقوامی رشتوں، ادبی مزاج کی تبدیلی، اور بغاوت کے شدید رویوں پر روشنی ڈالی، شاعری سے مثالیں دیں اور تجزیہ بھی کیا۔ سامعین نے نہ صرف انتہائی توجہ اور انہماک سے میرے معروضات کو سنا بلکہ ہر نکتے پر تحسین و آفرین کا غلغلہ بھی رہا۔ بعد میں سوال و جواب کا سلسلہ مزید ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ آخر میں فیض صاحب نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہندوستان کے جدید شاعروں کے بارے میں ان کی معلومات میں اضافہ ہوا اور وہ خطبے سے محظوظ ہوئے۔ سب نے بے حد داد دی، لیکن اصل چیز تو وطن سے ہزاروں میل دور ان لوگوں کی محبت تھی۔ افتخار عارف نے فی الواقع لندن کی اہم اور قابلِ ذکر شخصیتوں کو مجتمع کر دیا تھا اور یہ تقریب ہر لحاظ سے ایک یادگار تقریب تھی۔

وہ رات عجیب رات تھی۔ سب راتوں کی رات اور سب دنوں کا دن۔ احباب کا تقاضا تھا کہ کم از کم ایک ہفتہ کے لیے ٹکٹ اور بڑھوالوں اور فی الحال نہ جاؤں لیکن ایسا ممکن نہ تھا۔ کئی انجمنوں اور اداروں سے معذرت کر ہی چکا تھا۔ عشائیہ کا اہتمام راج کھیتی نے کیا تھا۔ طے تھا کہ تمام احباب پہنچیں گے۔ عبداللہ حسین اور محسن شمسی سے تو ابھی مل بیٹھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ جب مجمع چھٹا تو کاریں ساؤتھ ہال کی طرف روانہ ہوئیں۔ ساقی فاروقی، عبداللہ حسین، افتخار عارف، محسن شمسی، رما پانڈے، اطہر راز، سوہن راہی، اور کئی دوسرے احباب ساتھ تھے۔ خاصی لمبی مسافت طے کرنے کے بعد ساؤتھ ہال میں نشست ہوئی۔ میں کچھ کچھ تھکا ہوا تھا۔ وطن سے ہزاروں میل دور اردو کے اس ماحول میں ایک عجیب اپنائیت اور رس تھا جس کا ذکر لفظوں میں ممکن نہیں۔ دیر تک لطفِ صحبت رہا لیکن گردشِ شام و سحر کس کے بس کی ہے۔ جانا تو ٹھہر ہی گیا تھا۔ باہر آکر جب لوگوں نے الوداع کہی تو

جذبات کی فراوانی سے کچھ کہا نہیں گیا۔ ساقی فاروقی دوست احباب کو راستے میں اتارتے چڑھاتے ڈیڑھ دو بجے گھر پہنچے۔ کسی چیز کو کچھ دیر ایک جگہ چھوڑ دیجیے، جڑ پکڑنے لگتی ہے۔ پھولوں بھرا آنگن، دروازے کی محراب، لان کی منڈیر، اداس سی گلی، لیکن جو دل آباد رکھتے ہیں، زمین نہیں پکڑتے۔ مگر ساقی فاروقی نے تو برسوں پہلے دل میں گھر کر لیا تھا۔ شاید ہم اس رات سو نہیں سکے۔ پرواز آٹھ بجے صبح تھی۔ ساقی نے طے کیا لندن کی سڑکیں بہت صبح ٹریفک سے بھرنے لگتی ہیں فاصلہ بھی خاصا ہے۔ پانچ بجے گھر سے نکل کھڑے ہوں گے۔ ابھی آفتابِ عالم تاب کی کرنوں نے ہیتھرو کو اپنے لمس سے سرشار نہیں کیا تھا کہ ہم ایئرپورٹ پہنچ گئے۔ اِکّا دُکّا مسافر اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ کافی شاپ سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ یہ ورق کتنی جلدی پلٹ گیا۔ کتابِ دل پر بہت کچھ لکھ گیا اور کیا کچھ مٹ گیا۔ یادیں صرف دستِ حنائی کی دھندلی لکیر ہی نہیں ہوتیں، وقت کے خنجر پر خون کے کچھ چھینٹے ایسے بھی پڑ جاتے ہیں جنھیں دھوتے ہوئے انسان رو رو دیتا ہے۔ ساقی نے کہا یار تم رکے نہیں۔ میں نے کہا تم تو کراچی آؤ گے، دہلی بھی ضرور آنا، زندہ رہے تو مل بیٹھیں گے ورنہ یہی سمجھ لینا قلم روِ ہند میں کوئی تمھارا آشنا بستا تھا، نہ رہا۔ افسوس کہ یہ دن کتنی جلد گزر گئے:

ساقی ہے اک تبسمِ گل فرصتِ بہار
ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں (سودا)